خلائی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست

جان ایوری

ترجمہ: ارشد رازی

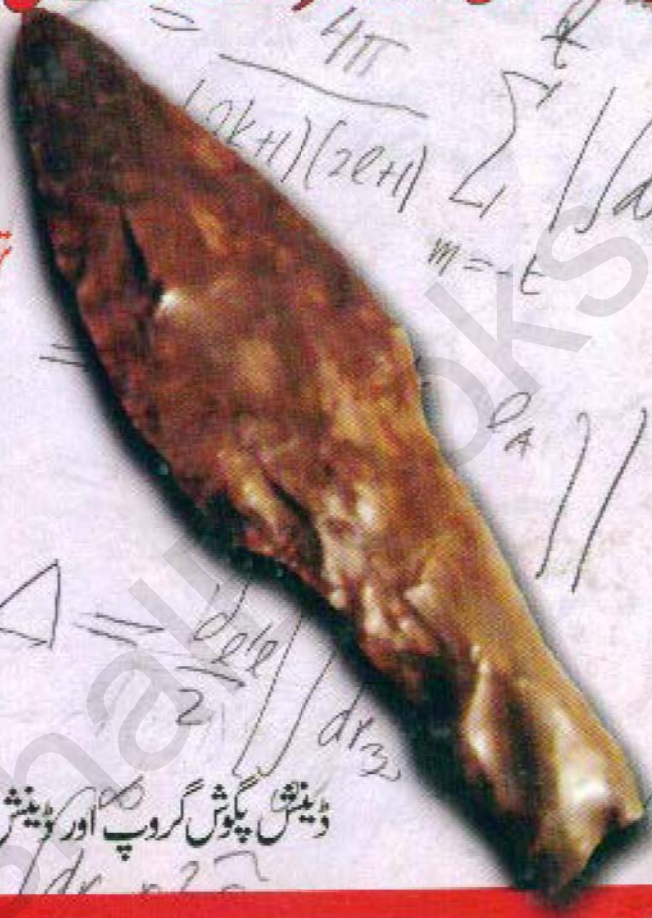

ڈینش پگوش گروپ اور ڈینش امن اکیڈمی

SPACE AGE SCIENCE
STONE AGE POLITICS

John Avery

مشعل

MashalBooks.org

خلائی سائنس

اور

پتھر کے زمانے کی سیاست

جان ایوری

ترجمہ: محمد ارشد رازی

The free electronic download of this book has been made possible by the generous financial assistance provided by:

Mrs. Amina Khatoon
Karachi

مشعل بکس

آر بی ۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن

لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

ترتیب

باب		صفحہ
	تعارف	5
	پیش لفظ	7
1.	دنیا کیسی ہے، اور کیسی ہو سکتی تھی؟	13
2.	قبائلیت	21
3.	قومیت؛ ایک باطل مذہب	39
4.	مذہب: مسئلہ کا جزو یا حل	58
5.	سائنس کی بدولت جنگ کی ہیئت میں آنے والی تبدیلی	79
6.	نیوکلیائی ہتھیاروں کی دوڑ	91
7.	جنگ کی قیمت	113
8.	جنگ کا کاروبار	126
9.	تعلیم برائے امن	150
10.	عالمی حکومت	167

MashalBooks.org

تعارف

اخباروں میں چھپنے والی خبروں کے بین السطور اگر پڑھا جائے تو ہمیں ایک ہولناک ملغوبہ سا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ملغوبہ خلائی دور کی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست کا ہے۔ اس کتاب میں اس کشمکش اور اس بے چینی کا تجزیہ کیا گیا ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں نہایت تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور اس کے برعکس سیاسی اداروں کی سست رفتار تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو ہم قریب قریب نو حجری دور کے اپنے آبا و اجداد جیسے ہی ہیں لیکن ہمارے ارد گرد کی دنیا نو حجری دور کی نہیں ہے۔ اس کی جگہ کوانٹم تھیوری، نظریہ اضافیت، سپر کمپیوٹر، اینٹی بایوٹکس، جینیٹک انجینئرنگ اور خلائی دُور بین کی دنیا نے لے لی ہے۔ بدقسمتی سے اس میں ایٹمی ہتھیار اور اعصابی گیس بھی شامل ہوگئی ہے۔ جس تیزی کے ساتھ انسانی کلچر مسلسل تبدیل ہو رہا ہے اس کے مقابلے میں انسان کا جینیاتی ارتقا بہت ہی سست ہے۔ اسی لیے انسانی جسم اور انسانی جذبات اس نئے طرز حیات سے مطابقت نہیں پیدا کر پا رہے ہیں۔ انسانی جسم اور جذبات ابھی تک جانوروں کا شکار کرنے اور جنگل سے اپنی غذا اکٹھی کرنے والے اپنے اجداد کے طرز زندگی کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ چنانچہ بجلی کی سی تیزی سے تبدیل ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمارے بہت سے افکار اور ادارے فرسودہ اور ناکارہ بنا دیئے ہیں۔

پرانی وضع کے جنگ وجدل پسند سیاست دانوں کا طرز عمل ایسا ہے جیسے وہ ابھی تک پتھر کے زمانے میں ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جب وہ ایک دوسرے کو

MashalBooks.org

(اور ہمیں بھی) دھمکیاں دیتے ہیں تو وہ بھالے اور کلہاڑی سے لڑنے کی دھمکی نہیں دیتے بلکہ اب ان کے پاس تھرمو نیوکلیر ہتھیار ہیں۔ اب چونکہ نئے ہتھیار بے پناہ تخریبی طاقت رکھتے ہیں اور چونکہ آج کے زمانے کے گلوبل مواصلات آناً فاناً ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اس لیے جنگ کا ادارہ ایک نہایت ہی خطرناک تاریخی تضاد بن گیا ہے۔ بلکہ ایک مکمل خودمختار اور طاقت ور قوم بھی ایک تاریخی تضاد ہی بن گئی ہے۔

''خلائی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست'' میں اس مسئلے پر غور کیا گیا ہے کہ اپنے سماجی اور سیاسی اداروں کو تیز رفتار سائنسی اور ٹیکنالوجیکل کامیابیوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنا چاہئیں۔

MashalBooks.org

پیش لفظ

جدید سائنس کی بدولت انسان کو تاریخ میں پہلی بار بھوک، ٹھنڈک اور متعدی مرض کے مسلسل خطرے سے پاک آسائش کی زندگی گزارنے کا موقع ملا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سائنس نے ہی اسے پہلی بار موقع فراہم کیا ہے کہ وہ نیوکلیائی ہتھیاروں سے اپنی تہذیب کو معدوم کر دے یا کثرت آبادی اور آلودگی سے اس کرۂ زمین کو ناقابل رہائش بنا دے۔ ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے لیے درست طرز عمل کا تعین زندگی اور موت کا سوال بن چکا ہے۔

کیا ہم جدید سائنس کی دریافتوں کو تعمیری انداز میں استعمال کرتے ہوئے حیات کے استقرار کی راہ اختیار کریں گے یا اسی سائنس کی مدد سے اپنے ہتھیاروں کو مہلک سے مہلک کرتے جائیں گے اور جلد یا بدیر کسی تکنیکی یا انسانی غلطی کے ہاتھوں نیوکلیائی جنگ چھیڑ بیٹھیں گے۔ کیا ہم اپنے اس خوبصورت سیارے کو آبادی اور صنعت کے لامحدود پھیلاؤ سے تباہ کر دیں گے؟ موجود متبادلات میں سے کسی ایک کا فیصلہ ہم انسانوں کو خود کرنا ہے۔ آج

MashalBooks.org

ہم تاریخ کے نہایت فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہیں اور یہ تہذیب کے لیے بحران کا لمحہ ہے۔

اگر ہم جینیاتی ارتقا کے پیمانہ وقت پر دیکھیں تو ہماری نوع نے حیران کن تیز رفتاری کے ساتھ تمدنی ارتقا کی منازل طے کی ہیں۔ انسانوں کو اس کرۂ ارض پر رہتے کم و بیش دو ملین سال ہونے کو آئے۔ تقریباً یہ سارا دورانیہ ہمارے اجداد نے اپنی خوراک شکار اور پھل اکٹھا کرنے کے عمل سے حاصل کی۔ ان کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی اور وہ دیگر جانوروں کی طرح ہی زندگی بسر کرتا تھا۔

پھر اچانک پچھلے دس ہزار سال کے مختصر عرصے میں ہماری نوع کی تعداد پھٹ پڑی۔ اور چند ملین سے بڑھ کر چھ بلین ہو گئی۔ کرۂ ارض کے کم و بیش تمام حصوں میں آباد انسان چاند تک جا پہنچا ہے۔ جینیاتی اعتبار سے ہم لوگ اپنے انہی اجداد کی طرح ہیں جو 10 تا 40 ہزار سال کے دوران اس کرۂ ارض پر موجود تھے۔ لیکن تمدنی انقلاب نے ہمارا طرزِ حیات نا قابلِ شناخت حد تک بدل دیا۔

> نو حجری دور میں آنے والے زرعی انقلاب اور پھر تحریر کی ایجاد کے بعد انسانی تمدن نے بے تحاشہ رفتار کے ساتھ ترقی کی۔ اس گراف میں دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ چار ہزار سال میں انسانی آبادی کس طرح بڑھی ہے۔ جب زراعت کی تکنیک بذریعہ کلچر نسل در نسل منتقل ہوئی تو آبادی میں تیز تر اضافہ ہونے لگا جو شکار اور اشیائے خوردنی اکٹھا کرنے والوں کے ممکن نہیں تھا۔ پرنٹنگ کی ایجاد اور اس کے اضافے میں ہونے والی سائنسی اور صنعتی ترقی نے بھی آبادی میں اضافے کو ہوا دی۔

اِس گراف سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے تمدنی ارتقا میں بے پناہ کامیابی حاصل کی ہے لیکن حالیہ برسوں میں اسکا تقریباً عموداً ہو جانا بتاتا ہے کہ اس کا استحکام خطرے میں ہے۔

انسانی ثقافتی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں تبدیلی کی شرح اتنی سست تھی کہ جینیاتی تغیر اس کا ساتھ دیتا رہا۔ کئی ملین سال تک گویائی اور ہتھیاروں کا استعمال انسانی دماغ کی جسامت

MashalBooks.org

کے ساتھ ساتھ روبہ ترقی رہا۔ سست روی کے اس عہد میں تمدنی اور جینیاتی ارتقا میں توازن موجود تھا۔ تاہم جب انسان اپنی ثقافتی انفارمیشن کو بہتر طریقے سے ذخیرہ کرنے کے قابل ہوا تو جینیاتی ارتقا اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ جینیاتی اعتبار سے ہم اپنے نوحجری دور کے اجداد کی طرح ہیں لیکن تمدنی اعتبار سے کوانٹم نظریئے، اضافیت، سپر کمپیوٹر، اینٹی بائیوٹک اور جینیاتی انجینئرنگ تک جا پہنچے۔ ہماری آج کی دنیا بدقسمتی سے نیوکلیائی ہتھیاروں اور اعصاب شکن گیس کی دنیا بھی ہے۔ جینیاتی ارتقا اور ثقافتی تبدیلی کی رفتاروں میں موجود بے پناہ فرق کے سبب ہمارے ذہن اور جسم نئے طرزِ زندگی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ہمارے تمدن کے مختلف پہلوؤں میں بھی تبدیلی کی رفتار مختلف رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تبدیلی نہایت تیزی سے آئی جبکہ ہمارے سماجی ادارے اور ڈھانچے بہت سست رفتاری سے بدلے۔ چنانچہ انفارمیشن پر مبنی ہمارے آج کے معاشرے میں موجود عدم استحکام کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ہمارا توارثی رویہ اس کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ یہ بھی ہے کہ رویے، قوانین اور اداروں کی ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں بہت سست ہے۔

یوں ہماری سائنس خلانوردی کے عہد میں ہے جبکہ سیاست پتھر کے زمانے کی۔ یہی حال رہا تو مستقبل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے تغیر کی تیز رفتاری شدید تر اخلاقیاتی تناقضوں اور سماجی تناؤ کو جنم دے گی۔ ہماری بقا اسی میں ہے کہ ہم اخلاقیات اور سیاست کے اعتبار سے بلوغت کے لیے کوشش کریں۔

سائنس دو دھاری تلوار بن کر سامنے آئی ہے۔ اس نے ہمیں بہت سی سہولتیں دی ہیں اور بہت سے خطرات سے دو چار کیا ہے۔ نیوکلیائی ہتھیاروں کے اس عہد میں پیچھے مڑ کر دیکھیں تو مسلسل چار بلین سالوں کا ارتقا ملتا ہے لیکن ہم کسی درجہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے سامنے بطور نوع اتنا لمبا مستقبل بھی موجود ہے۔

آبادی میں اضافے کی رفتار دکھانے والے گراف سے پتہ چلتا ہے کہ زمین بہت جلد

MashalBooks.org

اپنی گنجائش کی آخری حدوں کو پہنچنے والی ہے۔ کیا ہم اس خطرے کا تدارک کرنے کی سوچیں گے یا بطور نوع معدوم ہونے کو ترجیح دیں گے۔ عالمی آبادی کے استحکام کے علاوہ انفارمیشن پر مبنی انسانی معاشرے کو مستقبل کا ایک اور خطرہ بھی لاحق ہوگا۔ انسان کو جنگ کا ادارہ ختم کرنا ہوگا ورنہ مستقبل میں بننے والے ہتھیار تو ایک طرف اس کے موجودہ ذخائر ہی اسے ختم کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔ انسان کی فطرت میں موجود قبائلیت کا عنصر جنگ کے ادارے کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

انسان اپنے عزیز و اقارب پر مہربان رہتا ہے اور اپنے خاندان، قبیلے اور وطن کے لیے قربانی کا جذبہ دکھاتا چلا آیا ہے۔ قبائلی وابستگی نے قبائل کے مابین دشمنی کو جنم دیا۔ فٹ بال ٹیموں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی بھی اسی قبائلیت کی تسکین ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آرتھر کوئسلر کو ایک بار کہنا پڑا، ''ہم ایک دور دراز سیارے کے گرد گردش کرتے خلائی جہاز کی حرکت کو کنٹرول کر سکتے ہیں لیکن شمالی آئرلینڈ کی صورتحال کو نہیں۔'' سپین کے مصنف آرٹیگا گیسٹ نے اسی بات کو یوں کہا، ''ہم ایک ایسے عہد میں زندہ ہیں جب اشیا کا آقا انسان خود اپنا آقا نہیں ہے۔''

ارتقائی قوتوں نے کیوں کر قبائل کے مابین جارحیت کو انسانی فطرت کا حصہ بنا دیا اور کس طرح ایک انسان میں اپنے قبیلے کے ساتھ وابستگی نے جنم لیا۔ اسی سوال کو یوں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ میدان جنگ میں اپنے قبیلے کے لیے جان دینے کے عمل میں ہمارے اجداد نے اپنی جینوں کی بقا کے امکانات میں کیوں کر اضافہ کیا؟ تیس کے عشرے میں ماہر جینیات آر اے فشر اور ارتقائی حیاتیات داں ہیلڈین نے اس موضوع پر کام کیا اور حالیہ برسوں میں ڈبلیو ڈی ہملٹن نے اس پر کام کیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کشمکش جینیاتی اعتبار سے متجانس گروہوں کے مابین تھی اور ارتقائی قوت اس پر بطور اکائی عمل کرتی تھی۔ اس طرح کے گروہوں کو آج ڈی ای ایم ای (Deme) کہا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

ہیلڈین اور فشر نے مفروضہ قائم کیا کہ ہمارے اجداد بہت چھوٹے قبائل میں بستے تھے جو جینیاتی اعتبار سے متجانس ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ شادی کے مواقع گروہ کے اندر زیادہ تھے۔ جب کوئی فرد کسی دوسرے گروہ کے زیادہ سے زیادہ افراد کو قتل کرنے کے بعد مارا جاتا تھا تو اس عمل میں اس کے قبیلے کی جینیاتی بقا کے امکان بڑھ جاتے تھے جو اصل میں اس کی اپنی جینیاتی بقا تھی۔ یوں مرنے سے پہلے مخالف کے زیادہ سے زیادہ افراد مارنے کا رویہ وجود میں آیا اور یہ فرد قبیلے کا ہیرو کہلایا۔ قبائل بحیثیت مجموعی مرتے یا جیتے تھے۔ اور زیادہ گروہی وابستگی کے حامل قبائل کی بقا کا امکان بڑھ جاتا تھا۔

اس مفروضے کا اطلاق آج کی دنیا میں موجود نسلی گروہوں کے مابین موجود تصادم کو سمجھنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنگ کے ادارے کا خاتمہ ممکن نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے دنیا بھر کے تعلیمی نظاموں، مذہبوں اور ذرائع ابلاغ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ انسانی رویے پر حیاتیاتی توارث کے ساتھ ساتھ تمدنی اور سماجی تناظر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ آج ضروری ہے کہ ہم دنیا بھر میں بچوں کو تعلیم کے ذریعے گروہوں کی بجائے انسانیت کے ساتھ وابستگی کا درس دیں۔ ہمیں ایسے بین الاقوامی حکومتی اداروں کی ضرورت ہے جو ریاستوں کی بجائے افراد کو کنٹرول کریں۔ مسائل مشکل سہی لیکن اگر انفارمیشن پر مبنی ہمارے معاشرے کو زندہ رہنا ہے تو یہ سب کرنا ہوگا۔ ہمیں نہ صرف عالمی آبادی کو مستحکم رکھنا ہوگا بلکہ جنگ کے ادارے کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے ان توارثی جذبوں کو لگام دینا ہوگی جو پچھلے چالیس ہزار سال سے غیر متغیر چلے آرہے ہیں۔ مزید براں سیاسی نظام کو بدلتے ہوئے مطلق خود مختار قومیت کی جگہ بین الاقوامی سیاسی نظام کے متعلق سوچنا ہوگا۔ انسانی ذہن نے ایٹم کے اندر جھانکا ہے۔ اسے اپنے دل کے تضادات اور تناقضات کو بھی دور کرنا ہوگا۔

جنگ سے پاک منصفانہ اور مستحکم دنیا کی تعمیر مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ آج بھی

MashalBooks.org

دنیا کے کئی بڑے خطوں میں جنگ ختم ہو چکی ہے اور وہ اس مقصد کے لیے نمونہ فراہم کر سکتے ہیں۔ ارجنٹائن، برازیل، ریاستہائے متحدہ، چین اور ہندوستان جیسے خطے تمام ترنسلی، لسانی اور مذہبی تنوع کے باوجود داخلی امن سے ہمکنار ہیں تو اس کوشش کا دائرۂ کار کرۂ ارض تک پھیلایا جا سکتا ہے۔

اقوام متحدہ کا منشور، انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ اور بین الاقوامی فوجداری عدالت نئی دنیا کی طرف درست قدم ہیں۔ لیکن ان اداروں کو تقویت اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں مطلوبہ اصلاحات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور ماضی اور حال کی کامیاب فیڈریشنوں کی مثالوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آج ہمیں نئی عالمی اخلاقیات کی ضرورت ہے تا کہ خاندان اور قوم کے ساتھ وفاداری کی تصعید کے ذریعے انسانیت کے ساتھ وفاداری کو فروغ دیا جائے۔ نوبل انعام یافتہ حیاتیاتی کیمیا داں سرنٹ گیارگی نے کہیں لکھا تھا:

'' بیسویں صدی کے اوائل میں جدید سائنس کا ظہور ہوا تو انسان کی کہانی دو حصوں میں بٹ گئی۔ کہانی کے پہلے حصے میں انسان ایک ایسی دنیا کا باسی تھا جس میں یہ نوع پیدا ہوئی اور اس کے حواس ماحول کی مطابقت میں ڈھلے۔ کہانی کے دوسرے حصے میں انسان ایک قطعی نئی اور کائناتی دنیا میں داخل ہوا جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ اس کے ہاتھ لگنے والی نئی قوتیں ارضی نہیں تھیں بلکہ کائناتی تھیں۔ یہ قوتیں کائنات ساز ہیں اور انسانی ابعاد سے بالاتر۔ انسان چند سو فارن ہائیٹ کی ارضی آگ سے واقف چلا آ رہا تھا کہ اس کا واسطہ ایٹمی تعاملات کی دس ملین درجے کی آگ سے پڑا جو سورج کو روشن رکھے ہوئے ہے۔''

'' لیکن ابھی محض آغاز ہے اور دونوں طرف بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ انسانی زندگی خوشحالی اور وقار کے بے مثال عہد سے بھی ہمکنار ہو سکتی ہے اور اچانک المناک انجام سے بھی۔ انسان ایک ایسی کائناتی دنیا میں رہنے لگا ہے جس کے لیے وہ بنایا نہیں گیا تھا۔ اس کی بقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہ کتنی جلدی اور کتنی اچھی طرح خود کو اس کے مطابق ڈھالتا

ہے۔اس عمل میں انسان کو اپنے تمام خیالات اور سماجی اور سیاسی ادارے بدلنا ہوں گے۔''

''..... جدید سائنس نے زماں اور فاصلوں کو اقوام کے درمیان حائل نہیں رہنے دیا۔ ہماری آج کی اِس سکڑی سمٹی دنیا میں صرف ایک گروپ زندہ رہ سکتا ہے یعنی انسان بطور ایک خاندان۔''

MashalBooks.org

1

دنیا کیسی ہے، اور کیسی ہو سکتی تھی؟

سفر کا آغاز کرنے سے پہلے منزل کا علم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم سفر سے پہلے دیکھیں گے کہ ہمیں کس طرح کی دنیا درکار ہے۔

اپنے ذہن میں لائیں کہ آپ کیسی دنیا چاہتے ہیں۔ یہ دنیا ممکنات میں سے ہونی چاہیے۔ جو واقعی موجود ہو سکتی ہے ورنہ حاصل نہ ہو پائے گی۔ پھر اس کا تقابل آج کی دنیا سے کریں۔ ایک لمحے کے لیے بھول جائیں کہ آج کی دنیا کو آپ کے خیال کی دنیا میں کیسے بدلا جا سکتا ہے۔

ابھی کچھ سال پہلے میں نے اپنے دوست کیلڈ ہیلمر پیٹرسن (**Keld Helmer**

MashalBooks.org

Petersen) کے ساتھ مل کر اس طرح کی ایک فہرست بنائی تھی۔ ہماری فہرست یوں ہے: (اپنی آپ خود بنائیں)

1- آج کی دنیا میں ہتھیاروں پر سالانہ کوئی ایک ٹریلین امریکی ڈالر خرچ کئے جائے ہیں۔ ممکنہ دنیا میں ہتھیا روں پر ضائع ہونے والی رقم قحط، بھوک، جہالت اور بیماری سے بچنے کے لیے خرچ ہوگی۔

2- آج کی دنیا میں ہر انتالیس سال کے بعد آبادی دوگنا ہو جاتی ہے۔ آبادی میں یہ اضافہ زیادہ تر ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے اور ان میں سے کئی ایک کی آبادی پچیس سال سے بھی کم عرصے میں دوگنا ہو جاتی ہے۔ قحط اب بھی موجود ہے اور مستقبل میں پھیلے گا اور شدید تر ہو جائے گا۔ ہمارے خیال کی دنیا میں آبادی کو ایک ایسی سطح پر ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ خوراک اور توانائی کے عالمی وسائل سے بخوبی استفادہ کیا جا سکے۔ ہر ملک اپنی آبادی کے ٹھہراؤ کا خود ذمہ دار ہوگا اور کسی ملک کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے شہریوں کی بڑی تعداد کو باہر بھجوا کر دوسروں کے لیے مسائل کھڑے کریں۔

3- آج کی دنیا میں ہتھیاروں کے ذخائر اتنے زیادہ ہیں کہ زمین پر موجود ہر نفر کو کئی بار ہلاک کرنے کو کافی ہیں۔ نیوکلیائی ٹیکنالوجی پھیل رہی ہے اور سیاسی عدم استحکام سے دوچار کئی ممالک نیوکلیائی ہتھیار بنا چکے ہیں یا بہت جلد بنا لیں گے۔ حتیٰ کہ دہشت گرد گروپ اور منظم جرائم پیشہ لوگوں کے استعمال کا اندیشہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں ریاستوں کو نیوکلیائی ہتھیار بنانے اور رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہی اصول بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں پر بھی لاگو ہوگا۔

4- آج کی دنیا میں 40 فیصد تخفیفی فنڈ اسلحہ سازی کے منصوبوں کے لیے مخصوص ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں سائنس اور انجینئرنگ میں ہونے والی تحقیق انسانیت کو درپیش فوری مسائل کے حل کے لیے ہوگی۔ بیماریوں کے علاج کے بہتر طریقے وضع ہوں گے، توانائی کے نئے ماخذ دریافت ہوں گے اور زراعت کے نئے طریقے سوچے جائیں گے۔ یونیسکو پھلے پھولے گی اور فوجی اداروں کی جگہ سائنس اور انجینئرنگ کی سرپرستی کرے گی۔

5- آج کی دنیا میں بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی عام ہے۔ نسل

MashalBooks.org

کشی،تشدد، اذیت دہی اور مقدمہ چلائے بغیر سزا، سب اس میں شامل ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے افراد کو بچانے کے لیے کہیں زیادہ اختیارات ہوں گے۔

6- آج کی دنیا میں صنعتی ممالک سے تیسری دنیا کو سالانہ کوئی سترہ بلین ڈالر کے ہتھیار برآمد ہوتے ہیں۔ یوں کم ترقی یافتہ ممالک میں تصادم اور اختلاف زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے قلیل فنڈ فوری ضروریات پر خرچ نہیں کر پاتے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں ہتھیاروں کی بین الاقومی تجارت کو قابل نفاذ قوانین میں محدود رکھا جائے گا۔

7- آج کی دنیا میں سالانہ دس ملین بچے فاقے اورغذا کی قلت سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے سبب مر جاتے ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں بین الاقوامی برادری موجودہ سے کہیں بڑے پیمانے پر زرعی ترقی کے پروگراموں کے لیے معاونت فراہم کرے گی۔

8- آج کی دنیا میں سالانہ چھ ملین بچے غیر محفوظ پانی پینے سے پھیلنے والی پیٹ کی بیماریوں کے ہاتھوں مر جاتے ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں مناسب حفظان صحت اور پینے کے قابل پانی کی فراہمی کے انتظام کو ترجیح دی جائے گی اور ان مقاصد کے لیے دنیا کے ہر حصے میں فراواں بین الاقوامی فنڈ مہیا ہوں گے۔

9- آج کی دنیا میں ملیریا، تپ دق، ایڈز، ہیضہ،ٹائیفائڈ، ٹائفس ،ٹراکوما اور ایسی ہی دیگر بیماریوں سے سالانہ ملینوں لوگ مرجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اندازہ ہے کہ اس وقت کوئی دوسوملین لوگ(Schistosomiasis) میں مبتلا ہیں اور پانچ سوملین ٹراکوما میں؛ جو اکثر اندھے پن میں بدل جاتی ہے۔ صرف افریقہ میں سالانہ ایک ملین بچے ملیریا سے مرتے ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں ان قابل علاج بیماریوں پر بین الاقومی کوششوں سے قابو پایا جائے گا۔اس منصوبے کے لیے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کو مناسب فنڈ دیئے جائیں گے۔

10- آج کی دنیا میں پچیس ترقی پذیر ترین ممالک میں ناخواندگی اسی فیصد ہے۔اندازہ ہے کہ دنیا میں ناخواندہ افراد کی کل تعداد 800 ملین ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں بین

MashalBooks.org

الاقوامی برادری دنیا کے تمام بچوں کو کم از کم ابتدائی تعلیم دینے کا عزم کر لے گی۔ ایسے والدین کے خلاف قانون بنیں گے جو اپنے کم عمر بچوں کو آمدن کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یوں آبادی میں اضافے کے ایک محرک کا خاتمہ ہو گا۔ چند سال بعد ہی تعلیم پر کی ہوئی سرمایہ کاری منافع دینے لگے گی۔

11- آج کی دنیا میں بین الاقوامی قانون کے نفاذ کا کوئی نظام موجود نہیں۔ اگرچہ انٹرنیشنل کریمنل کوڈ کا قیام اپنی جگہ درست قدم ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پاس قانون سازی کا اختیار موجود ہو گا۔ دنیا کے تمام شہری ان قوانین کے پابند ہوں گے اور اقوام متحدہ ان کے نفاذ کے لیے خلاف ورزی کرنے والوں کو خواہ وہ سربراہان ریاست ہی کیوں نہ ہوں گرفتار کر لے گا یا جرمانہ سنائے گا۔ تاہم اقوام متحدہ کے قوانین کو بین الاقوامی معاملات تک محدود رکھا جائے گا۔ ہر قوم اندرونی معاملات اپنے قوانین کے مطابق چلائے گی۔

12- آج کی دنیا میں ہر قوم خود کو ''خود مختار'' سمجھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر ملک سمجھتا ہے کہ وہ عالمی برادری کی فلاح کا خیال کئے بغیر جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر طوائف الملوکی موجود ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں قومی خود مختاری کا تصور عالمی برادری کی ضروریات کے مطابق محدود کر دیا جائے گا۔ ہر قوم زیادہ تر معاملات کا فیصلہ اپنی حدود کے اندر خود کرے گی لیکن بین الاقوامی معاملات میں اسے اپنی کچھ خود مختاری سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

13- آج کی دنیا میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اندر ایک قوم ایک ووٹ کا اصول رائج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مناکو، لکشمبین، مالٹا اور انڈورا کے ووٹ کی طاقت بھی وہی ہے جو چین، انڈیا، ریاستہائے متحدہ اور روس کے ووٹ کی ہے۔ اسی وجہ سے اقوام متحدہ کی قراردادیں اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں جنرل اسمبلی کے ووٹنگ سسٹم کی اصلاح کی جائے گی۔ ایک ممکنہ منصوبہ یہ ہو سکتا ہے کہ حتمی ووٹ ممالک کی بجائے مختلف بلاک ڈالیں اور ہر بلاک کو ایک ووٹ دیا جائے۔ مثال کے طور پر نو بلاک ہو سکتے ہیں۔ (1) لاطینی امریکی بلاک (2) افریقی بلاک (3) شمالی بلاک (4) یورپی بلاک (5) روسی اور وسط ایشیائی بلاک (6) چینی بلاک

MashalBooks.org

(7) انڈیا اور جنوب مشرقی ایشیا (8) مشرق وسطیٰ اور(9) جاپان،کوریا اور اوشنیائی بلاک۔

14- آج کی دنیا میں اقوام متحدہ کے پاس محاصلات کا کوئی قابل اعتبار ذریعہ موجود نہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں اقوام متحدہ کے پاس کرنسیوں کے تبادلوں جیسے بین الاقوامی کاروباروں پر ٹیکس لگانے کا اختیار موجود ہوگا۔ ہر رکن ریاست سالانہ مالی حصہ ڈالے گی اور یہ حصہ ادا نہ کرنے کی صورت میں اسے حق رائے دہی سے محروم کر دیا جائے گا۔

15- آج کی دنیا میں نوجوانوں کو قومی افواج میں شامل ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پھر انہیں اپنے جیسے انسانوں کو قتل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کی آواز پر یہ کام نہ کریں تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں قومی افواج بہت کم کر دی جائیں گی۔ اقوام متحدہ بین الاقوامی قوانین نافذ کرنے کے لیے رضا کاروں کی ایک بڑی فوج رکھے گی۔ بھاری ہتھیاروں پر اقوام متحدہ کی اجارہ داری ہوگی۔ نیوکلیائی ہتھیار بنانے کی ممانعت کر دی جائے گی۔

16- آج کی دنیا میں نوعمر لوگوں کے اذہان میں قومیت پرستی ٹھونسی جاتی ہے۔ تاریخ اس انداز میں پڑھائی جاتی ہے کہ اسے اپنی قوم اور اپنے ہیرو برحق نظر آتے ہیں جبکہ دوسری اقوام ادنیٰ اور دشمن لگتی ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں نوجوانوں کو اس طرح کی تعلیم دی جائے گی کہ انہیں انسانیت کے ساتھ وابستگی کا پاس رہے۔ تاریخ اس انداز میں پڑھائی جائے گی کہ انسانی ثقافتی ورثے میں تمام اقوام اور نسلوں کا حصہ واضح ہو جائے۔

17- آج کی دنیا میں نوجوانوں کو اکثر بے روزگاری کا سامنا رہتا ہے۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک دونوں میں یہ مسئلہ موجود ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں آٹو میٹک مشین اور عالمی بحران یہ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں یہ مسئلہ آبادی کی زیادتی اور سرمائے کی کمی کے سبب وجود میں آتا ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں عالمی کمیونٹی نوجوانوں کی توانائی کو جہالت اور بیماری کے خلاف جنگ اور تیسری دنیا میں صنعت اور زراعت کی ترقی کے لیے استعمال کرے گی۔ اقوام متحدہ کرنسی کے بین الاقوامی لین

دین کے ٹیکس سے ملنے والے محاصلات استعمال کرتے ہوئے ان منصوبوں کے لیے وسائل فراہم کرے گی۔

18- آج کی دنیا میں عورتیں آبادی کے نصف سے زیادہ ہیں لیکن آرٹس اور سائنس یا اقتصادی اور سیاسی عہدوں پر ان کی نمائندگی متناسب نہیں ہے۔ کئی معاشروں میں عورتوں کو گھر داری اور بچوں کی دیکھ بھال تک محدود رکھا گیا ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں تمام تمدنوں کی عورتیں حکومتی اور صنعتی عہدوں پر اور فنون وعلوم میں مردوں کے شانہ بشانہ ہوں گی۔ بچے کی دیکھ بھال اور پیدائش پر زور کم ہوگا تو آبادی کے بڑھنے کی رفتار بھی سست پڑ جائے گی۔

19- آج کی دنیا میں آلودگی ہمارے دریاؤں، سمندروں اور ہوا میں پھینکی جاتی ہے۔ آلودگی پر قابو پانے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے لیکن ضرورت سے بہت کم ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں آبادی ایک جگہ ٹھہر جائے گی یا اس سے بھی کم ہو جائے گی۔ یوں ماحول پر دباؤ کم ہوگا۔ دریاؤں، سمندروں اور کرۂ ہوائی میں آلودگی کو ٹھکانے لگانے کے خلاف سخت قانون بنائے جائیں گے۔ بین الاقوامی قوانین کے تحت گرین ہاؤس گیسوں کی پیداوار محدود کی جائے گی۔

20- آج کی دنیا میں معدوم ہوتی انواع کے شکار کے خلاف کوئی قابل نفاذ قوانین موجود نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے مقامی انسانی تمدن بھی خطرے سے دوچار ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار انواع کو بچانے کے لیے قابل نفاذ بین الاقوامی قوانین کا ایک نظام موجود ہوگا۔ مقامی تمدنوں کو بھی محفوظ رکھا جائے گا۔

21- آج کی دنیا میں حاری بارانی جنگلوں کے بہت بڑے رقبے لکڑی کی بڑھتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کاٹے جا رہے ہیں۔ یوں صاف ہونے والی زمین عام طور پر کاشت کاری کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال کی دنیا میں اس امر کو اہمیت دی جائے گی کہ جنگلات کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آکسیجن میں بدلتے رہیں اور یہ عمل زمین کے ماحولیاتی استحکام کے لیے بہت ضروری ہے۔ ان جنگلات کو اس لیے بھی وقعت دی جائے گی کہ یہاں نباتاتی اور حیوانی زندگی موجود ہے اور اس کی

MashalBooks.org

حفاظت ضروری ہے۔

22- آج کی دنیا میں دہشت گرد اکثر محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اپنے نقطۂ نظر کے حامی ممالک سے ہمدردی اور پناہ مل جائے گی۔ ہمارے خیال کی دنیا میں دہشت گردی اور ہائی جیکنگ پر ایک بین الاقوامی کنونشن ہوگا اور دہشت گردوں کو چھپنے کی جگہ نہ ملے گی۔

23- آج کی دنیا میں ایشیا، مشرق وسطیٰ اور لاطینی امریکہ کے بعض علاقوں میں افیون اور نشہ آور ادویات پیدا کرنے والے دیگر پودے بلا رکاوٹ اگائے جاتے ہیں۔ ان پودوں سے حاصل ہونے والی نشہ آور اشیا غیر قانونی طور پر ترقی یافتہ ممالک کو بھیجی جاتی ہیں جہاں یہ انسانی المیے اور جرائم کی شرح بلند کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ ہمارے خیال کی دنیا میں تمام ممالک مضر مرکبات اگانے، بنانے اور تقسیم کرنے پر بین الاقوامی طور پر مربوط پروگرام کے ذریعے قابو پائیں گے۔

24- آج کی دنیا میں ٹیلی وژن، فلم اور اخبار جیسے جدید ذرائع ابلاغ لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ تاہم ان اثرات کو بین الاقوامی تفہیم اور بین الاقوامی تعظیم کا جذبہ ابھارنے کے لیے شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں ابلاغ عامہ کے ذرائع کو انسانی فرق پر قابو پانے کے لیے برتا جائے گا۔ تضادات وتفاوات کو ابھارنے والے سنسنی خیز پروگراموں کی جگہ انہیں ہمدردی اور باہمی تفہیم کے پروگراموں کے لیے برتا جائے گا۔

25- آج کی دنیا میں لسانی رکاوٹ بھی بین الاقوامی افہام وتفہیم کی راہ کی رکاوٹ ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں ایک بین الاقوامی زبان منتخب ہوگی اور ہر بچے کو بطور ثانوی زبان سکھائی جائے گی۔

26- آج کی دنیا میں طاقت اور مادی اشیا کو بے جا طور پر زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ آج کا مہذب طرز حیات اکثر و بیشتر یوں بدل جاتا ہے کہ سب لوگ اقتدار اور املاک کے لیے سب لوگوں کے خلاف جدوجہد کرنے لگتے ہیں۔ تاہم صنعتی پیداوار کے نظام کو تیز سے تیز تر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہمیں جلد ہی توانائی اور خام مال کی کمی کا سامنا ہوگا۔ ہمارے خیال کی دنیا میں مہربانی، تہذیب، شائستگی اور علم جیسی غیر مادی انسانی اقدار اور

MashalBooks.org

موسیقی، فن یا ادب کی اہمیت کو زیادہ وقعت دی جائے گی اور لوگ باہمی گفتگو اور محفوظ رکھے گئے قدرتی مناظر سے محظوظ ہونا سیکھیں گے۔

27- آج کی دنیا میں غلامی کا ادارہ اتنے ہزار سال سے چلا آ رہا ہے کہ انسانی سماج کا ایک مستقل حصہ نظر آنے لگا ہے۔ اب غلامی دنیا کے بیشتر حصوں میں ممنوع قرار دی گئی ہے لیکن، غلامی سے بھی بڑی برائی، جنگ ایک انسانی ادارے کے طور پر آج بھی موجود ہے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں جنگ کے خاتمے سے حوصلہ اور جرأت لے کر توانائی کو جنگ کے خاتمے پر مرکوز کیا جائے گا۔

28- ہماری آج کی دنیا میں لوگ مستقبل کے متعلق پریشان ہیں لیکن اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ انہیں لگتا ہے کہ وہ بطور فرد بڑے پیمانے پر ہونے والے واقعات کو متاثر نہیں کر سکتے۔ ہمارے خیال کی دنیا میں عام لوگوں کو لگے گا کہ وہ اجتماعی طور پر مستقبل کو تشکیل دے سکتے ہیں۔ وہ ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لیے باہمی تعاون کریں گے۔ وہ امن کے لیے اتنی ہی جدوجہد کریں گے جتنا امن ضروری ہے۔

جارج برنارڈ شا نے ایک بار کہا تھا، ''دنیا زیادہ تر لوگوں کو اسی طرح کی نظر آتی ہے جیسی کہ وہ ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ کیوں؟'' ہم دنیا کو اس طرح دیکھیں گے جیسی یہ ہونی چاہیے اور پھر پوچھیں گے، ''کیوں نہیں؟'' اگلا حصہ نسبتاً سخت ہے۔ یہاں سے وہاں تک کا سفر کیسے ہو سکتا ہے؟ ہماری بقیہ کتاب کا موضوع یہی ہے۔

MashalBooks.org

2

قبائلیت

عصبیت

چونکہ سائنس کے غلط استعمال کے سبب خوف ناک ہتھیار وجود میں آ چکے ہیں اور مستقبل میں بھی بنتے رہیں گے۔ اس لیے تہذیب کی بقا اسی میں مضمر ہے کہ جنگ کا ادارہ ختم کر دیا جائے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ یا ان جذبات کو روکنا ممکن ہے جو انسانی فطرت کا حصہ ہیں اور انسان کو جنگ سے روکنا اتنا ہی مشکل بنا دیتے ہیں جتنا کہ بلیوں اور کتوں کو لڑنے سے؟ کیا حیاتیاتی علوم اس مسئلے پر کوئی روشنی ڈالتے ہیں کہ آخر ہماری یہ مفروضہ شعور سے متصف نوع امن، خوشی اور زندگی کی بجائے جنگ، اذیت اور موت کو چننے پر کیوں تلی ہے؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے ہمیں (Ethology) سے رجوع کرنا ہوگا جو جانوروں اور ہم انسانوں میں جذباتی رجحانات اور رویے کے نمونوں کے مطالعے کا علم ہے۔

MashalBooks.org

اپنی کتاب ''اوریجن آف سپیشیز'' میں چارلس ڈارون نے جبلتوں کے ارتقا پر ایک پورا باب شامل کیا تھا۔ بعد ازاں اسی موضوع پر اس نے ایک پوری کتاب "The Expression of Emotions in Man and Animals" شائع کروائی۔ ان مطالعات کے سبب ڈارون کو ایتھالوجی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

ڈارون کے اس کام کے پس پردہ یہ مشاہدہ کارفرما تھا کہ جبلی رویے کے نمونے بھی جسمانی خدوخال کی طرح وراثت میں آگے چلتے ہیں۔ ڈارون اس امر سے بھی متاثر تھا کہ ایک خاص نوع کے اندر بھی رویے کے خاص درجے کے نمونوں میں ایک خاص درجے کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک خاص خاندان کے اندر انواع کے مابین جبلی رویے کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بلی کے سارے خاندان میں بلی کے رویے کی اکائیاں ملتی ہیں۔ اسی طرح بھیڑیئے کے سارے خاندان کے ارکان میں کتے اور بھیڑیئے کے سارے ارکان کے کچھ نہ کچھ عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ کسی بھی ایک نوع کے تمام ارکان کا رویہ بالکل ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر سارے پالتو کتے ایک سے رویہ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

ڈارون اپنی کتاب ''اصل الانواع'' میں لکھتا ہے: ''آیئے ایک نظر کتوں کی ایک نسل پر ڈالتے ہیں۔ نوعمر پوائنٹر کو باہر لے جایا جائے تو ان کا رویہ کسی قدر طے شدہ ہوتا ہے۔ پوائنٹر کتوں کا رویہ شیفرڈ کتے سے مختلف ہوگا۔ اگرچہ انہیں اپنے رویہ کے نتائج کی خبر نہیں لیکن ان کی مختلف نسلوں کے رویے کافی حد تک متعین ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹے سے پوائنٹر کو علم نہیں ہوتا کہ اس کی کونسی خوبی اس کے ممالک کے لیے مفید ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سفید تتلی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے انڈے گوبھی کے پتے پر کیوں دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فعل خالصتاً جبلت کے مسائل ہیں۔ جب کتوں کی مختلف نسلوں کی باہمی نسل کشی کروائی جاتی ہے تو ان کے خصائص کا ملاپ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بل ڈاگ اور گرے ہاؤنڈ کا ملاپ کروانے سے گڈریا کتے میں خرگوشوں کا پیچھا کرنے کی جبلت در آتی ہے۔

ڈارون کا خیال تھا کہ فطری انتخاب کے ذریعے مطلوبہ جبلت آگے چلائی جا سکتی ہے۔ اس طرح وہ سمجھتا تھا کہ شہد کی مکھیوں کی چھتے بنانے کی جبلت بہت پیچیدہ سہی لیکن

MashalBooks.org

سادہ جبلّتوں کے فطری انتخاب کے نتیجے میں متشکل ہوئی ہے۔ڈارون اپنی کتاب "The Expression of Emotions in Man and Animals" میں لکھتا ہے،

''میں اس اہم موقف کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ کیا انسان کی تمام نسلوں میں ایک ہی قسم کے جسمانی تاثر اور جسمانی حرکات پائی جاتی ہیں خاص طور سے یورپی نسلوں میں؟ اور کیا ایک ہی طرح کی حرکات ایک قسم کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں؟ یوں، یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے اظہار ان کی اندرونی ساخت میں شامل ہیں اور جبلی ہیں۔''

اس حوالے سے شواہد اکٹھے کرنے کے لیے ڈارون نے انسانی جذبات پر ایک سوالنامہ چھپوایا اور اسے دنیا کے مختلف حصوں میں مصروف کار مشنریوں اور نوآبادیوں کے منتظمین کو بھجوایا۔سولہ سوالوں پر مشتمل سوالنامے میں یہ چار سوال بھی شامل تھے:

1) کیا حیرت کا اظہار کرنے کے لیے آنکھوں اور منہ کو استعمال کرتے ہوئے بھنویں اٹھائی اور منہ کھولے جاتے ہیں؟

2) شرماتے وقت جلد پر سرخی دوڑ جاتی ہے اور یہ سرخی چہرے سے نیچے کہاں تک جاتی ہے؟

3) کسی مرد کی ہتک کی جائے تو وہ جسمانی ردعمل کے طور پر کیا کرتا ہے؟ اس کا جسم تنتا ہے، کندھے بلند ہوتے ہیں اور وہ اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا ہے؟

4) کسی مسئلے پر گہرا غور وفکر کرتے ہوئے وہ آنکھیں کسی جگہ پر مرکوز کرتا ہے یا اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے سکڑتے ہیں؟

اسی طرح کے سوالوں پر مشتمل اس سوالنامے کے چھتیس جوابات موصول ہوئے۔ یہ جواب دنیا کے دور دراز کے گوشوں میں انسانی گروپوں کے متعلق تھے۔ان نتائج نے اسے قائل کر دیا کہ انسانی جذبات اور ان کے اظہار کے طریقے تمدن سے متعین نہیں ہوتے بلکہ بڑی حد تک انسانی ساخت میں شامل ہیں۔اپنی اس کتاب کی تیاری میں ڈارون نے نومولود بچوں اور نوعمر بچوں کا بغور مشاہدہ بھی کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنے تمدن سے بہت زیادہ متاثر ہونے سے پہلے انسانی بچے کا رویہ کیسا ہوتا ہے۔اپنے مشاہدات کے نتیجے میں ڈارون نے نتیجہ اخذ کیا کہ انسان اور دیگر ممالیہ میں جذبات اور ان کا اظہار نوع کے موروثی خصائص میں شامل ہیں۔

بیسویں صدی میں بھی وراثت میں چلنے والے رویے کے نمونوں کا مطالعہ جاری رہا۔

MashalBooks.org

کارل فان فرش(Karl von Frisch) نکولسٹنبر جن(Nikolaas Tinbergen) اور کانرڈ لورینز(Konrad Lorenz) کو اسی طرح کے کاموں کے اعتراف میں طب و فعلیات کا1969ء کا نوبل انعام ملا۔

رویے کے مذکورہ بالا ماہرین میں سے فرش نے شہد کی مکھیوں کے رقص پر کام کیا تھا۔ یہ مکھیاں ایک خاص طرح کے ڈانس کے ذریعے ایک دوسرے کو خوراک کے منابع کے متعلق آگاہ کرتی ہیں۔ فرش نے 1945ء میں رقص پر اس زبان کی رمز کشائی کی تھی۔ یہ رقص اور اس کے تمام تر رموز ان مکھیوں کے اندر توارث کی سطح پر موجود ہوتے ہیں۔* مکھیاں ایک دوسرے کو خوراک کے منبع کا فاصلہ اور سمت بھی بتاتی ہیں۔ان کی اس حرکت کے مطالعے سے ان ماہرین کو پتہ چلا کہ مکھیاں اپنے اس طریقے سے انفارمیشن کے سات بٹس فراہم کر سکتی ہیں۔ تین بٹس کا تعلق فاصلے سے اور چار بٹس کا سمت سے ہوتا ہے۔ فرش نے یہ بھی دریافت کیا کہ مکھیوں کی مختلف نسلوں میں یہ زبان تھوڑی تھوڑی مختلف ہے۔ یوں اس نے اس رقص کے ارتقاً پر کام کا آغاز بھی کیا۔

ٹنبرجن نے اپنا زیادہ تر کام پرندوں پر کیا۔ گلز(Gulls) پر اس کا کام کلاسیک بن چکا ہے۔ اس نے دیکھا کہ جب بیرنگ گل کا چوزہ انڈے سے باہر آتا ہے تو وہ چونچ اپنے والدین کی چونچ کی طرح ہی کیوں ٹھکراتا ہے۔ تجربات کے ایک طویل سلسلے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی چونچ پر لگا ایک سرخ نشان نومولود گل کو ضروری مہیج مہیا کرتا ہے۔ اس نے والدین پرندوں کے کئی ماڈل بنائے لیکن سرخ نشان کی عدم موجودگی میں نومولود گل نے ان کی چونچ کو نہ ٹھکرایا۔ تجربات کے ایک اور سلسلے میں ٹنبرجن نے انڈے سے نئے نئے نکلنے والے گلز کے چوزے اور عقاب کے باہمی تعلق پر کام کیا۔ چوزے انڈے سے نکلتے ہی عقاب کو شناخت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ عقاب کا خوف یقیناً ان کی جینیاتی ساخت میں پروگرام کی سطح پر شامل ہوگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ عقاب میں ایسی کون سی شے ہے کہ بہت کم عمر چوزے بھی اسے شناخت کر لیتے ہیں۔ اس نے عقاب کے کئی ماڈل آزمائے۔ آخر اس نے عقاب کی شکل کا ماڈل چوزے کی طرف اور دم مخالف سمت میں رکھی۔ جب دم چوزے کی طرف تھی اور باز و مخالف سمت میں تو اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔

یوں ٹنبرجن اس نتیجے پر پہنچا کہ بیرنگ گل کی طرح چوزے کا ردعمل بھی ماحولیاتی

آموزش کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے دماغ کی پروگرامنگ میں شامل ہے۔ چونکہ یہ رویہ چھلکا توڑ کر نکلتے چوزے میں پہلے سے موجود ہے۔ چنانچہ سکھلائی اس ماحولیاتی نمونے کو متاثر نہیں کرتی۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جانور اور انسان میں رویے کے بعض نمونوں میں آموزش یقیناً

* جب خوراک کا مرکز نزدیک ہوتا ہے تو مکھیوں کی حرکت میں دائرے سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ مرکز انتہائی نزدیک ہو تو مکھیاں ایک اور حرکت استعمال کرتی ہیں۔ جسے راؤنڈ ڈانس کہا جاتا ہے۔

اہم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد پہلے سے موجود جینیاتی سانچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

اپنی اس بات کی وضاحت کے لیے ٹنبرجن گڈریا کتوں کی مثال دیتا ہے جن کے اجداد بہت پہلے بھیڑیئے تھے۔ ان کتوں کو آسانی تربیت دی جاسکتی ہے کہ وہ بھیڑوں کا گلہ ہانک کر گڈریئے کی طرف لے جائیں۔ البتہ انہیں یہ تربیت دینا مشکل ہوتی ہے کہ وہ بھیڑوں کو ہانک کر گڈریئے سے پرے لے جائیں۔ ٹنبرجن وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ رکھوالا کتا گڈریئے کو گروہی رہنما سمجھتا ہے۔ وہ بہت پہلے بھیڑیا تھا۔ اس کی جبلت میں شامل ہے کہ شکار کو گھیر کر گروہ کے لیڈر کی طرف لے جائے۔ اسی لیے اسے یہ سکھانا آسان ہے کہ وہ گلے کو گھیرے اور گڈریئے کی طرف لے جائے۔ اس کی جبلت میں موجود نہیں کہ شکار کو ہنکا کر اپنے لیڈر سے پرے لے جائے۔ اسی لیے اسے یہ سکھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ گلے کو ہانک کر گڈریئے سے دور کر دے۔

ٹنبرجن نے نومولود انسانی بچے کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ زبان سیکھ جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے اندر موجود جینیاتی لسانی بنیاد ہے۔ وہ کون سی زبان سیکھتا ہے اس کا انحصار ماحول پر ہے۔ لیکن حیران کن کم مدت میں بولنے اور سمجھنے کی اہلیت جینیاتی رجحانات پر ہے۔ 1973ء کے تیسرے نوبل انعام یافتہ کونرڈ لورینز کا کام متنازعہ ہونے کے باوجود بہت دلچسپ ہے۔ اس نے جنگ کی وجوہات پر کام کیا اور غور کرتا رہا کہ اس سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔ بچپن میں وہ جانوروں کا شائق تھا اور اس کے بردبار والدین نے اسے گھر میں جانوروں کی ایک بڑی تعداد پالنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ آبی پرندوں کا مطالعہ اس نے بالخصوص شروع میں کر لیا تھا اور معروف مظہر امپرنٹنگ (Imprinting) تک جا پہنچا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ بطخ وغیرہ کے بچے انڈے سے

نکلنے کے فوراً بعد کے کچھ وقفے میں جو پہلی چیز دیکھتے ہیں اسے ہی اپنی ماں سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی ایک تصویر کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔لورینز کم کم پانی میں کھڑا ہے اور اسے ماں سمجھنے والے مرغابی کے بچے اس کے گرد جمع ہیں۔لورینز نے آبی پرندوں میں جوڑے بننے کے عمل کا مطالعہ بھی کیا۔

تاہم لورینز کی اصل وجہ شہرت اس کی معروف کتاب"On Aggression" ہے جو اتنی ہی متنازعہ بھی ہے۔اس کتاب میں وہ گروپوں کے مابین اور گروپ کے اندر جارحانہ رویہ کا مطالعہ کرتا ہے۔اس نے دیکھا کہ گروپ کے اندر مرتبے کی لڑائی شاذ ہی مہلک ثابت ہوتی ہے۔مثال کے طور پر بھیڑیوں کے ایک گروہ میں سرداری پر لڑائی ہوتی ہے۔حریفین میں سے کوئی ایک اطاعت کا اظہار کرتا ہے تو لڑائی فوراً ختم ہو جاتی ہے۔یہ لڑائی گروپ کے اندر کی لڑائی ہے۔اس کے برعکس گروپوں کے مابین لڑائی فریقین میں سے ایک کی موت پر ختم ہوتی ہے۔مثال کے طور پر چیونٹیوں کی کالونیوں کے درمیان ہونے والی لڑائی یا شہد کی مکھیوں کا اپنے چھتے پر حملہ آور ہونے والوں کے خلاف دفاع یا چوہوں کے گروہ کا اجنبی چوہوں کے خلاف ردعمل سب اسی ذیل میں آتا ہے۔

انسان سمیت بہت سے جانور اپنی اپنی کمیونٹیوں کے دفاع میں مارنے یا مرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔اس رجحان کو لورینز کمیونٹی کے دفاع کا ردعمل کہتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ جب انسان اپنی کمیونٹی کے دفاع میں ہیروؤانہ عمل پر آمادہ ہوتا ہے تو اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک ''مقدس جھرجھری'' محسوس ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح کا ردِعمل ہے جیسے دشمن کا سامنا ہونے پر جانور کی پیٹھ کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور جانور اپنی اصل جسامت سے بڑا نظر آنے لگتا ہے۔

کانرڈ لورینز اور اس کے شرکائے کار پر شدید تنقید ہوئی کہ انہوں نے جبلتوں کا تنقیحی ماڈل متعارف کروایا ہے۔لورینز کہتا ہے کہ اگر کوئی جبلت عرصے تک استعمال نہیں ہوتی تو وقت کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال کے لیے دباؤ بڑھنے لگتا ہے۔انسانی جارحیت کا بھی یہی حال ہے۔اعصابی توانائی کو کسی بے ضرر طریقے سے خارج کرنا ہوگا تاکہ اصل جنگ کا متبادل میسر آ سکے۔وہ سمجھتا ہے کہ ٹیم کی شکل میں ہونے والے کھیل معاشرے میں جارحیت اور تشدد کی سطح کو نیچے لاتی ہیں۔لورینز کے اس اخذ کردہ نتیجے پر اعتراض کرنے والوں میں

MashalBooks.org

رویے کے نامور ماہر پروفیسر ہائینڈ(Hinde) بھی شامل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جارحیت کے تنقیحی ماڈل کا کوئی تجربی ثبوت موجود نہیں۔ ہائنڈ کا کہنا ہے کہ غیر مستعمل جبلتیں بالآخر مسخ ہونے لگتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پرزور ٹیم پر مبنی کھیل یا ٹیلی وژن پر دکھائے گئے پرتشدد پروگرام کا ماڈل معاشرے میں اب زیادہ تر غلط مانا جاتا ہے* اور مجھے بھی

* پروفیسر ہائنڈ نے مصنف کے نام اپنے 1985ء کے ایک خط میں لکھا، ''ڈیئر ڈاکٹر ایوری! آپ کا پمفلٹ "The World as it is and the World as it could be" (باقی آئندہ صفحہ پر)

پروفیسر ہائینڈ کے خیالات سے اتفاق ہے۔ لیکن لورینز نے کمیونٹی کے دفاعی ردعمل کا جو خیال پیش کیا ہے وہ درست اور مفید ہوسکتا ہے۔ کمیونٹی کے دفاع کا میکنزم انسانی تہذیب کا وہ پہلو ہے جس کی بنا پر سپاہیوں کے لیے اپنے اپنے ملک کے دفاع میں مارنا اور مر جانا عین فطری عمل بن جاتا ہے۔ نیوکلیائی ہتھیاروں نے جنگ کو اتنا خطرناک بنادیا ہے ورنہ یہ بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ ملک کے لیے مرنا عین مناسب بلکہ مطلوبہ خوبی خیال کی جاتی تھی۔ آج کی دنیا میں بھی قوم پرست قوم اور مذہب کے لیے مرنے کو مستحسن گردانتے ہیں۔

تاہم تباہی کے نئے ہتھیاروں کے سبب قوم پرستی اور پُر تعصّب حب الوطنی خطرناک کاروبار بن گئے ہیں۔ تشدد اور جنگ کے متعلق بات کرتے ہوئے ہمیں ذہن میں رکھنا ہوگا کہ روزمرہ کے چھوٹے موٹے جھگڑے اور پہلی جنگ عظیم یا ہیروشیما وناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کے پیچھے کارفرما رویے الگ الگ چیزیں ہیں۔ بیویوں کا شوہر کے ہاتھوں پٹنا یا بار روم میں کبھی کبھار کی ہاتھا پائی گروپ کے اندر کی لڑائیاں ہیں جو جانور اپنی صفوں میں آگے بڑھنے کے لیے لڑتے ہیں۔ اپنی کمیونٹی کے دفاع کے لیے ہیروؤانہ جدوجہد کا رویہ زمانوں تک قابل تعریف سمجھا گیا۔ لیکن اب تہذیب کی بقا کے لیے خطرہ بنتا جارہا ہے۔ قبائلیت کے سبب جنگ ہوسکتی ہے۔ اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے ساتھ ہونے والی جنگ تہذیب کو برباد کرسکتی ہے۔

آرتھر کوئسلر (Arthur Koestler) اپنے ایک مضمون "The Urge to Self Destruction"* میں لکھتا ہے، ''تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی پتہ چل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ): نہایت فکر انگیز دستاویز ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خاصی پھیلے گی۔ البتہ مجھے مزید مطالعہ کے حوالے سے آپ کی مجوزہ کانرڈ لورینز کی کتاب "On Aggression" کے متعلق کچھ کہنا

MashalBooks.org

ہے۔ اس کتاب سے پیغام ملتا ہے کہ انسانی جارحیت اس کی فطرت کا ناگزیر جزو ہے اور ہمیں اس کے غیر مضر انخلا کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اس کی بنیاد انسانی رویے کے کیتھارسس ماڈل پر ہے جو خاصا پرانا ہوگیا ہے۔ اصل پیغام یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کی تربیت اس انداز میں کریں کہ ان کے مزاج کی جارحیت کم ہوجائے۔ اور افراد کو ایسا ماحول مہیا کریں کہ جارحانہ اظہار کی ضرورت نہ رہے۔ مجھے آپ کی قابل تعریف اور اہم تحریر کے متعلق جو تحفظات ہیں آپ ان کے متعلق درگزر سے کام لیں گے۔

* اے ٹائسیلیئس (A, Tiselius) اور ایس نیلسن (S. Nielson) کی زیر ادارت چھپنے والی کتاب "The Place of Value in a World of Facts" مطبوعہ 1970 Wiley, New York -

جائے گا کہ خودغرضانہ محرکات کے تحت سرزد ہونے والے انفرادی جرائم قبیلے، قوم، سلطنت، مذہب یا آئیڈیالوجی کی بے لوث محبت کے سبب ہونے والے قتل عام کے مقابلے میں کہیں کم المناک تھے۔ جنگیں، ذاتی مفاد میں نہیں ہوتیں بلکہ بادشاہ ملک یا کسی مقصد کے ساتھ وفاداری کے تحت لڑی جاتی ہیں۔''

''ہم نے ہٹلر یوتھ میں شامل نوجوانوں کے چہروں سے فیوہرر کی محبت میں پھوٹتی توانائی دیکھی ہے۔ یہ لوگ محبت میں مبہوت ہیں۔ جس طرح مقدس تصویریں راہبوں کو مبہوت رکھتی ہیں۔ قومی ترانے کی آواز اور سربلند جھنڈے کا نظارہ آپ کو ایک عجیب محبت کرنے والی کمیونٹی کا حصہ ہونے کا احساس دیتا ہے۔ جنونی مذہبی اپنے مسجود کے لیے جان دینے کو ہر وقت تیار رہتا ہے اور اسی طرح وہ اپنے مرکز پرستش کے لیے امکانی خطرے کو ہلاک کرنے کے لیے بھی آمادہ رہتا ہے۔''

کوئسلر نے جن جذبات کو بیان کیا ہے وہ کمیونٹی کا دفاعی میکنزم یعنی ''عسکری ولولہ'' ہے جسے لورینز نے حیاتیاتی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ اپنی کتاب "On Aggression" میں کونرڈ لورینز اپنے گروپ کے لیے زندگی کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہیرو کے جذبات کو یوں بیان کرتا ہے:

''درحقیقت عسکری ولولہ بھی کمیونٹی کی جارحیت کی ایک خاص شکل ہے جو انفرادی جارحیت کی زیادہ بنیادی شکل کے ساتھ متعلق ہے لیکن اس سے منفرد نظر آتا ہے۔ خاصا جذباتی شخص بھی اپنے تجربے کی روشنی میں جانتا ہے کہ عسکری ولولے کے ردعمل میں معروضیت کم اور موضوعیت زیادہ ہے۔ محتاط مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ پیٹھ میں دوڑتی جھرجھری کی ایک لہر دونوں بازوؤں میں باہر تک پھیلتی ہے۔ فرد خود کو روزمرہ

زندگی کے علائق سے بلند اٹھتا محسوس کرتا ہے۔اور وہ جذبات کے اس خاص لمحے میں مقدس فریضہ نظر آنے والے مقصد کے لیے سب کچھ ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ راستے کی سب رکاوٹیں غیر اہم لگنے لگتی ہیں۔ اپنے ہی جیسے انسان کو زخمی یا قتل کرنے کے خلاف جبلی ممانعت اٹھ جاتی ہے۔غور وفکر تنقیدی نظر،استدلال سب اپنی قدر کھو بیٹھتے ہیں اور یہ حقیر اور ہتک انگیز نظر آنے لگتے ہیں۔ظلم وستم ڈھاتے مرد راہ حق پر ہونے کے احساس سے سرشار ہوجاتے ہیں۔فکری اور اخلاقی ذمہ داری کم ترین سطح پر چلی جاتی ہے۔ یوکرائن میں ایک محاورہ بولا جاتا ہے:''پرچم کھل جائے تو ساری منطق بگل میں ہوتی ہے۔

''اوپر بیان ہونے والے موضوعی تجربات کا تعلق ان معروضی مظاہر سے بھی ہے۔جسم تن جاتا ہے۔ بازو پہلوؤں سے اٹھتے ہیں اور قدرے اندر کی طرف آجاتے ہیں۔ کہنیاں باہر کی طرف نکل جاتی ہیں۔ سرفخر سے اٹھتا ہے۔ٹھوڑی باہر نکلتی ہے اور چہرے کے عضلات فلموں کے ہیروؤں کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ پشت اور بازوؤں کے باہر کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ جھرجھری کا وہ حصہ ہے جو نظر آتا ہے۔''

جس کسی نے بھی گروہ یا اپنے خاندان کے دفاع میں سرفروشی پر آمادہ چمپینزی کو دیکھا ہو گا وہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ اس انسانی ولولے کا تعلق کسی روحانیات سے بھی ہو سکتا ہے۔چمپینزی بھی اپنا جسم اکڑاتا ہے۔ کہنیاں اٹھاتا ہے۔ٹھوڑی باہر نکالتا ہے۔ اس کے بال بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور سامنے سے وہ بھی بڑا نظر آنے لگتا ہے۔ بازو بھی اس لیے اندر مڑتے ہیں کہ ان پر موجود لمبے بالوں والا حصہ سامنے کی طرف آجائے اور بازو زیادہ بڑے نظر آنے لگیں۔ یہ جسمانی رویہ اور بالوں کا یوں کھڑا ہونا سب دشمن کو دھوکہ دینے کا عمل ہے۔اسی طرح بلی بھی اپنی پشت میں کوہان پیدا کرتی ہے۔اور اس کا مقصد بھی زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک نظر آنا ہے۔

ہماری جسمانی جھرجھری جسے جرمن شاعری میں مقدس کہا گیا ہے۔ دراصل ماضی قدیم کے اس دور کی یادگار ہے جب اس حرکت میں جسم کے بال کھڑے ہو جاتے تھے اور اب وہ بال ہمارے جسم پر موجود نہیں۔ حیاتیاتی شواہد ڈھونڈنے والے کو دیکھنا چاہیے،''اگر کسی دوسرے سیارے سے کوئی غیر جانبدار مخلوق زمین پر چلی آئے اور آج کے انسان کو دیکھے کہ

اس کے ہاتھ میں اس کی ذہانت کی پیداوار ایٹم بم ہے اور اس کے دل میں اپنے انتھروپائیڈ (Anthropoid) اجداد سے ملنے والا کینہ اور جارحیت ہے جسے اس کی ذہانت بھی قابو میں نہیں رکھ سکی تو وہ انسان کو بقا کا موقع نہیں دے گا۔''

جنگ کا سبب بننے والی انسانی فطرت کے اجزائے ترکیبی کی بحث میں کچھ معنویاتی مشکلات بھی حائل ہیں۔ ابھی کا نرڈلورینز کے مذکورہ بالا پیرے میں ''عسکری ولولے'' کی بات ہوئی ہے۔وہ اسے کمیونٹی کی جارحیت اور کمیونٹی کے دفاعی ردعمل دونوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ انسان کے انہی جذباتی رجحانات پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر رابرٹ ہائینڈ اور سر جوزف راٹ بلٹ(Joseph Rotblat) نے ان کے لیے لفظ ''ڈیوٹی'' (Duty) استعمال کیا ہے۔ اس کے لیے لفظ ''قبائلیت'' استعمال کرنے کی وجہ موجود ہے۔ ارتقائی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جنگ کے حوالے سے انسان میں موجود جذبات اس تشکیلی دور میں چھوٹے چھوٹے قبائل کے درمیان زیر اثر علاقوں پر مقابلے کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ تب ہمارے یہ اجداد افریقہ کے گھاس کے میدانوں، شکار اور پھل اور پھول اکٹھا کرنے پر زندہ تھے۔ قبائلی گروہوں کے افراد باہم وفاداری کے رشتوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ خاندان، ٹیم، مذہب اور اسی طرح کے دوسرے گروہوں کے ساتھ انفرادی وفاداری کی صورت میں یہ بندھن آج بھی نظر آتے ہیں۔ اور انہی کے تحت ملکی افواج کے وفادار ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنے ملک کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں۔ جنگ وجدل میں صرف جارحیت ہی ملوث نہیں بلکہ ایثار بھی موجود ہے۔ سپاہی قتل کرتے ہیں لیکن اپنی جانیں بھی قربان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جنگ کے لیے حب الوطنی اور فرض بھی اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا مرنے پر آمادگی۔ آرتھر کوسلر بھی اس بات کو یوں بیان کرتا ہے، ''جنگ ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ بادشاہ، ملک یا مقصد کے ساتھ وفاداری یا وابستگی کے تحت لڑی جاتی ہے۔ قبائلیت میں اپنے گروپ کے ساتھ جذباتی وابستگی، گروپ کے لیے ذاتی قربانی، اسے دشمن سے بچانے کے لیے بوقت ضرورت مرنے یا مارنے پر آمادگی اور یہ ایقان کہ تنازعہ کی صورت میں اس کا گروپ ہمیشہ راستی پر ہوتا ہے، سب شامل ہیں۔

آبادی کی جینیات

MashalBooks.org

اگر ہم انسانوں میں جارحیت اور ایثار پسندی کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ہماری نوع اپنے بچوں کے لیے جذبہ ایثار سے سرشار ہے۔ ہم انسانوں میں رجحان پایا جاتا ہے کہ حیاتیاتی رشتہ جتنا نزدیکی ہوگا ہمارا ایثار اور مہربانی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ جب ہم ایثار کی اس ماہیت کو دیکھتے ہیں تو ڈارون کے فطری رشتہ داروں میں ایک سی جینیں موجود ہونے کا امکان زیادہ ہے اور ان کے باہمی تعاون کے نتیجے میں ان جینوں کی ترویج زیادہ بہتر ہو سکے گی۔

لورینز نے کمیونٹی کے دفاع کا نقطۂ نظر پیش کیا یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کمیونٹی کے دفاع میں مرنے اور مارنے پر تیار رہتا ہے۔ اگر ہم اس کے نقطۂ نظر کی وضاحت ارتقائی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہمارے اجداد چھوٹے قبائل میں رہتے تھے اور ان کی شادیوں کا امکان قبائلی حدود سے باہر کی بجائے قبائل کے اندر زیادہ ہوتا تھا۔ اگر حالات یہی تھے تو پھر ہر قبیلے کے افراد میں ایک ساجینیاتی مواد موجود ہونا چاہیے۔ تب فطری انتخاب کی اکائی فرد نہیں بلکہ قبیلہ یعنی گروپ ہوگا۔ ارتقائی انتخاب میں گروپ کا نظریہ سب سے پہلے تیس کے عشرے میں ہالڈین(Haldane) اور فشر(Fisher) نے پیش کیا اور حالیہ زمانے میں اسے ہملٹن نے تقویت دی۔

گروہی انتخابی ماڈل کے مطابق جن قبائل کے افراد میں ایثار موجود ہے ان کے پنپنے اور باقی رہ جانے کے زیادہ امکانات موجود ہیں بہ نسبت ان قبائل کے جن کے درمیان باہمی اتحاد کم ہے۔ چونکہ ان قبائل کے درمیان علاقے کی ملکیت کا جھگڑا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قبائل کے مابین چپقلش بھی جنم لے گی۔ اور باہمی ایثار کا حامل قبیلہ غالب رہے گا۔ یوں انتخاب کے گروہی ماڈل کی بنیاد پر انسانوں سے توقع کی جائے گی کہ وہ اپنے گروپ کے اندر مہربان اور ایثار پسند ہوں گے جبکہ دیگر گروپوں کے ساتھ اور بالخصوص متصادم مفادات کے حامل گروپ کے ساتھ جارحانہ رویہ اپنائیں گے۔ جہاں حدود زیادہ واضح ہوں گی مثلاً قبائل کے مابین شادی بیاہ نہیں ہوگا وہاں گروپوں کے درمیان جارحیت اتنی ہی شدید ہوگی۔

گروہی تشخص کی تشکیل

اگرچہ اصل میں انسان چھوٹے اور جینیاتی اعتبار سے متجانس قبائل میں آباد تھا لیکن جدید دنیا کے سیاسی اور سماجی گروہ نسبتاً بہت بڑے ہیں اور اکثر کثیر نسلی اور کثیر لسانی ہیں۔ دنیا

میں کئی ممالک میں اس طرح کا تنوع خاصا زیادہ ہے۔ برازیل، ارجنٹائن اور ریاستہائے متحدہ ایسے ہی ملک ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے ہر ملک کے اندر گروہی تشخص اور سماجی وابستگی موجود ہے۔ انڈیا اور چین بھی متنوع لوگوں کا ہجوم ہیں۔ لیکن یہاں اپنی جگہ معاشرتی ہم آہنگی موجود ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ گروہی تشخص ایک سماجی تشکیل ہے جس میں قبائلی حد بندیاں گروہوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔ ان قبائلی حد بندیوں کی تفصیل نیچے دی جائے گی۔

جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ داخلی امن اور سماجی ہم آہنگی عالمی پیمانے پر کس طرح ممکن ہے تو مستقبل کی کچھ امید بنتی ہے۔ چونکہ گروہی تشخص ایک سماجی تشکیل ہے چنانچہ ممکن نظر آتا ہے کہ ہم جدید دنیا میں پہلے سے موجود بڑے گروہوں کو وسعت دے کر تمام انسانیت پر محیط کرلیں۔

مذہب اور لسانی تشخص

تمام معاشروں میں مذہب کی کوئی نہ کوئی شکل موجود ہے اور لگتا ہے کہ کسی وجہ سے مذہب انسانی فطرت کے باطنی خصائص میں شامل ہے۔* ممکن ہے کہ جس طرح شکاری اور پھل اکٹھا کرنے والے اوّلین انسانی معاشروں میں تمدنی، ذہنی اور لسانی اہلیتوں کا ارتقاً ہوا ہے بالکل اسی طرح ان کئی ملین سالوں کے دوران انسانی مذہبی رجحانات کا ارتقاً بھی ہوا ہو اور یہ اپنی اصل میں تمدن کے استقرار اور اس کے تسلسل کا ایک ذریعہ ہو۔ آج کے انسان اور ہم سب کے اوّلین جد کے درمیان کی نسلوں نے نہ صرف لسانی ترقی کی بلکہ اپنی اوزار اور ہتھیار سازی کی صلاحیت بھی بڑھاتے رہے۔ جدول 2.1 میں کچھ اہم ہومینائیڈ انواع دکھائی گئی ہیں اور جدول 2.2 میں ان کے کچھ اہم کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

Table 2.1: Hominid species

genus and species	years before present	brain volume
Ardipithecus ramidus	5.8 to 4.4 million	

MashalBooks.org

Australopithecus anamensis	4.2 to 3.9 million	
Australopithecus afarensis	3.9 to 3.0 million	375 to 550 cm3
Australopithecus africanus	3 to 2 million	420 to 500 cm3

* دہریوں کے قریبی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بہت سوں کے نزدیک کلچر کے موسیقی، فن اور سائنس جیسے بعض پہلوؤں نے مذہب کی جگہ لے لی ہے۔

Australopithecus aethiopicus	2.6 to 2.3 million	410 cm3
Australopithecus robustus	2 to 1.5 million	530 cm3
Australopithecus boisei	2.1 to 1.1 million	530 cm3
Homo habilis	2.4 to 1.5 million	500 to 800 cm3
Homo erectus	1.8 to 0.3 million	750 to 1225 cm3
Homo sapiens (archaic)	0.5 to 0.2 million	1200 cm3
Homo sapiens neand	0.23 to 0.03 million	1450 cm3
Homosapiens sapiens	0.12 mil. to present	1350 cm3

Table 2.2: Palaeolithic cultures

name	years before present	characteristics
Oldowan	2.4 to 1.5 million	پتھر کے آلات
Choukoutien	1.2 to 0.5 million	مشرقی ایشیا کی چھوٹی کلہاڑی
Abbevillian	500,000 to 450,000	افریقہ، یورپ، شمال مشرقی افریقہ کی دستی کلہاڑی
Acheulian	400,000 to 200,000	ماہرانہ طور پر بنائی ہوئی پتھر کی کلہاڑی، آگ کا استعمال

MashalBooks.org

Clactonian	450,000 to 250,000	پتھر کے ترقی یافتہ آلات
Mousterian	70,000 to 20,000	نینڈر تھال کے بنائے ہوئے آلات کی ترقی، لکڑی کے بھالے، آگ، مردوں کو دفن کرنا
Aurignancian	50,000 to 20,000	مغربی یورپ، پتھر کے ہتھیاروں کے دھاردار پھل، ہڈی کا سوا، آگ اور غاروں کی تصویریں
Solutrian	20,000 to 17,000	فرانس اور وسطی یورپ، لمبے پتھر کے دودھاری پھل
Magdalenian	17,000 to 10,000	مغربی یورپ، برفانی ہرن کا شکار، ہڈی کا سوا اور سوئی۔

اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ انسانی ترقی کی رفتار کوئی چالیس ہزار سال پہلے تیز ہونے لگی تھی۔ آرٹ کے اوّلین نمونوں کا تعلق اسی عہد سے ہے جب آج کے جدید انسان نے آبنائے بیہرنگ عبور کی اور مغربی نصف کرّے میں پہنچا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی ستر ہزار سال پہلے سائبیریا کو الاسکا سے ملانے والا برفانی پل بنا جواب سے کوئی دس ہزار سال پہلے تک موجود تھا۔ سماجی اور جینیاتی مواد سے پتہ چلتا ہے کہ انسان پہلے پہل مغربی نصف کرّے میں اسی راستے سے پہنچا تھا۔ شامن ازم* ایشیا اور نئی دنیا دونوں میں پایا جاتا ہے۔ اور سکینڈے نیویا کے سامی (Lapp) لوگوں میں بھی موجود ہے۔ یہ حقیقت ان علاقوں کے شکاری معاشروں کے درمیان موجود ثقافتی تعلق کی مثال ہے۔

انسانی ثقافتی ترقی اور جینیاتی تغیر و ثقافتی تبدیلی بیک رفتار آگے بڑھے۔ لیکن گزشتہ چالیس ہزار سالوں کے دوران انفارمیشن کے اکٹھا ہونے کی شرح زیادہ ہوگئی اور نتیجتاً ثقافتی ارتقا کی رفتار جینیاتی ارتقا کو پیچھے چھوڑ گئی۔ یوں جینیاتی اعتبار سے ہم آج بھی اپنے ان اجداد کی طرح ہیں جو چالیس ہزار سال پہلے شکار پر گزارہ کررہے تھے لیکن ہماری تمدنی ترقی ارتقا کے بے شمار مراحل طے کر گئی۔ انسانی تمدنی ارتقا کی اہلیت مقابلتاً زیادہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ آموزشی رویے کی مدد سے اپنے رویے کے جبلی نمونوں پر حاوی ہوسکتے ہیں۔ جانوروں میں ہم انسان اس اعتبار سے بے مثال ہیں۔ آموزش میں کوئی

MashalBooks.org

دوسری نوع ہمارا مقابلہ نہیں کرتی۔ عین ممکن ہے کہ ثقافتی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں مذہب نے ہم انسانوں کو اپنے جبلی رویے پر حاوی ہونے میں مدد دی ہو۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ ارتقائی انتخابی قوتوں نے مذہبیت کی حمایت کی ہو اور یہ ہمارے جینوم میں چلی آ رہی ہو۔ بہت

* شکاری معاشرت میں شامن (Shaman) کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ سحر کی حالت میں بالائی، موجودہ اور زیریں دنیا میں آ جا سکتا ہے اور یوں بیماری سے شفا اور شکار میں کامیابی کی ضمانت دے سکتا ہے۔

سے مذاہب میں رہنماؤں اور دیوتاؤں کو ایک سا مقام حاصل ہے۔ مثال کے طور پر قدیم مصر میں فراعین کو دیوتاؤں کا درجہ حاصل تھا۔*

انسانی عبودیت کی مثالیں قدیم دنیا میں رومنوں اور یونانیوں کے ہاں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب مقدونیہ کے سکندر نے ایشیا پر حملہ کیا تو اس نے دیوتا ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔** یوں کئی مذاہب میں دیوتاؤں اور رہنماؤں کے کردار باہم بدلتے نظر آتے ہیں۔ اور اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ مذہب نے تمدنی میکانیت کو تسلسل دیا تاکہ جودت طبع اور دور اندیشی کے حامل رہنماؤں کو تعظیم ملے اور انہیں موت کے بعد بھی یاد رکھا جا سکے۔ چونکہ زبانوں کے ساتھ مذاہب بھی تمدنوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ یہ بھی لسانی تشخص کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں۔

قبائلی شناخت

حیاتیات میں انواع سے مراد ایسے گروہ ہیں جو باہم نسل کشی کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام انسان ایک نوع ہیں۔ کیونکہ اس وقت تک کوئی ایسی انسانی نسل موجود نہیں جو کسی دوسری انسانی نسل کے ساتھ افزائش نسل نہ کر سکے۔ اور پھر مختلف نسلوں کی باہمی شادیوں سے پیدا ہونے والے بچے بھی اگلی نسل پیدا کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ چنانچہ مختلف انسانی نسلوں کے درمیان شادی میں کوئی حیاتیاتی رکاوٹ موجود نہیں۔ اصل مسئلہ نسلی اور لسانی حد

* میوٹیشن کی صورت میں زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ کسی موجودہ جبلت میں تھوڑا سا تغیر لے آئے اور یوں اپنی نئی شکل میں یہ جبلت کسی بالکل مختلف مقصد کے لیے استعمال ہونے لگے۔ قطعی طور سے نئی جبلت کا وجود میں آنا کہیں کم ممکن ہے۔ ممکن ہے کہ مذہب کا رجحان دراصل کسی زندہ رہنما کی اطاعت کے رجحان کی متغیر شکل ہو۔ یعنی آنے والی نسلوں میں قدرتی صلاحیت کے حامل رہنماؤں کے ثقافتی کارناموں کو

MashalBooks.org

نقد میں عطا کر دی ہو۔ انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پر انسان ثقافتی انقلاب لے آتا ہے۔ تمدن کے ذریعے انسان جبلت پر حاوی ہوسکتا ہے۔ قدرتی انتخاب نے اس صلاحیت کے فروغ میں مدد کی ہوگی۔

** عام لوگوں کے دیوتا بن جانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اس کی ایک مثال طب کا مصری دیوتا (Impotep) ہے۔ حقیقت میں یہ شخص 2950 ق۔م میں زوسر (Zoser) نامی فرعون کا منتظم اعلیٰ، معتمد اور اعلیٰ پروہت تھا۔ اسی فطین معالج اور معمار نے مصر کا پہلا اہرام ڈیزائن کیا تھا۔ پتھر کے بھاری بلاکوں کو کاٹنے اور پھر اہراموں میں استعمال کرنے کی تکنیک بھی اسی نے وضع کی تھی۔ اس کی وفات کے بعد (Imhotep) کو معبود بنا لیا گیا اور لوگ علاج معالجہ کے لیے اس سے دعائیں کرنے لگے۔

بندی کا ہے جو اکثر بہت شدید ہوتی ہے۔

کانرڈ لورینز کے ایک طالبعلم آرینا س ایبل ایبسفلیڈ (Irenas Eibl Ebesfeldt) نے دو گروپوں کے درمیان شادیوں کو ناممکن حد تک مشکل بنانے والی ثقافتی حد بندیوں کو بیان کرنے کے لیے ایک لفظ ''باطل تخصیص'' (Seudospeciation) متعارف کروایا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں دونوں گروہ یوں عمل کرتے ہیں گویا ان کا تعلق الگ الگ انواع سے ہے حالانکہ حیاتیاتی اعتبار سے اس میں کوئی صداقت نہیں۔ جب اس طرح کے دو گروہ زمین کے ایک ہی ٹکڑے، پانی کے ایک ہی چشمے، ایک ہی طرح کے وسائل اور ایک سے ذرائع روزگار کے لیے کام کرتے ہیں تو ان کے درمیان اختلافات بہت شدید ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ سمجھتا ہے کہ دوسرا کم تر انسان ہے۔ اپنی کتاب "The Biology of War and Peace" میں ایبسفیلڈ انسانی گروہوں کے زیر استعمال آنے والی قبائلی نشانیوں کو استعمال کرتا ہے کہ وہ اپنے تشخص کو کس طرح نمایاں کرتے ہیں اور خود کو دیگر گروہوں سے متمیز رکھنے کے لیے کون سی حد بندیاں وضع کرتے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے اس نے افریقی قبائل میں بعض رسوم کے نتیجے میں چہروں پر پڑ جانے والے نشانوں کی تصویریں دی ہیں۔ چہرے پر موجود زخموں کے ان نشانوں کی نقل نہیں ہوسکتی۔ یہ نشان قبیلے کی مخصوص علامت ہیں۔ مشکل ہے کہ کوئی شخص یہ نشان دیکھے اور اسے پُرشیا کی افواج کے افسروں کے جسم پر لگے وہ نشان یاد نہ آئیں جو انہیں دوسروں سے متمیز کرتے تھے

انسانی نسلوں کو دیکھیں تو ایسی کئی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جو کسی مخصوص گروہ کے علامتی نشان ہوتے ہیں۔ ان سب نشانوں کو قبائلی علامتیں کہا جاسکتا ہے جیسے کہ جلد پر گودے جانے

والے نقش، کان، ناک اور ہونٹوں کی چھدائی، ناک یا کان میں پروئی جانے والی ہڈیاں، کان یا گردن کو لمبا کرنا۔

چینیوں کا پاؤں کو چھوٹا رکھنا، ختنے، زبان، ناک یا ناف کی آرائش اور لباس کی ٹائی، نقاب اور پگڑی جیسے اضافے، ہندوستان میں ذات کے نشان، عطریات کا استعمال یا عدم استعمال، نظام ہائے اقدار، میزبانی کی روایات، کھانوں کا حلال وحرام، بچوں کے روایتی نام، رقص اور گیت، مخصوص مصالحہ جات، مشترکہ کہانیاں، ادب، اساطیر، شاعری اور مشترکہ تاریخ، تہوار اور تقاریب، تدفینی رسوم، آباپرستی، گھر کی تعمیر وآرائش، کسی ثقافت کے مخصوص کھیل، جانوروں کے ساتھ تعلق اور گھوڑوں یا خاص جانوروں کے متعلق خصوصی علم اور ان پر سواری کی صلاحیت اور عقائد کے غیر منطقی نظام یہ سب انسانی گروہی شناختیں ہیں۔ ہمارے آج کے پر ہجوم بازاروں میں بیس بال کی الٹی ٹوپی پہنے چلتے نوجوان بھی کسی مخصوص ''قبیلے'' سے تعلق کے اظہار میں فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ آج کے نیویارک میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو کسی ایسے شخص کے ساتھ شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں جس میں جیسپر جونز(Jasper Johnes) کے فن کی تحسین کی اہلیت نہ ہو۔ لندن میں بھی بہت سے ہوں گے جنہیں ورجینیا وولف کی کتابوں سے بے بہرہ شخص کو مہذب ماننے میں تأمل ہوگا۔

اس وقت تک سامنے آنے والی نسلی شناختوں میں سے اہم ترین زبان ہے۔ اور پھر ایک خاص زبان کے اندر موجود بولیاں اور لہجے ہیں۔ اگر زبان کا مقصد محض ابلاغ ہوتا تو پھر ڈنمارک جیسے چھوٹے ملک کے باشندوں کے لیے منطقی راستہ یہی تھا کہ وہ اپنی زبان بولنا چھوڑیں اور انگریزی یا کسی زیادہ بین الاقوامی زبان کو اپنالیں لیکن زبان کا مقصد محض ابلاغ نہیں۔ یہ ابلاغ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ تشخص کا نشان ہے اور گروہی حدود کو تقویت دیتی ہے۔ ایک خاص زبان کے اندر بولیاں اور لہجے موجود ہیں جو ذیلی گروہوں کی شناخت ہیں۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں لہجے اور تلفظ کو بہت زیادہ سماجی وقعت دی جاتی ہے۔ جارج برنارڈ شا نے اپنے ڈرامے "Pigmalion" میں اس رجحان کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جسے بعد ازاں مائی فیئر لیڈی فلم سے مقبولیت ملی۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن اس کے باوجود انگلینڈ کے سبھی شہری ایلائزا ڈولٹل(Eliza Do Little) کی پیروی کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی وہ

اوکسفرڈ کے لہجے میں انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انہیں ڈر ہے کہ یوں ان کے گروہ کے لوگ ان پر ہنسیں گے اور انہیں اپنا غدار سمجھیں گے۔ دنیا میں ہر جگہ سکول کے بچے اپنے گروہ میں جگہ نہ پانے والے بچے کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ایٹن پبلک سکول میں اوکسفرڈ کا لہجہ لازمی ہے۔لیکن یارک شائر کے کسی سکول میں یہ لہجہ بچے کو عجیب الہیئت بنادے گا۔

زبان کے بعد اگلی اہم ترین قبائلی علامت مذہب ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ مذہب غالباً معاشرتی ارتقا کے آغاز میں قبائلی روایت اور تمدن کے تحفظ اور استقرار کے ایک طریقے کے طور پر وجود میں آیا ہوگا۔

ڈارون کے زیر مطالعہ رہنے والے لسانی اور چہرے کے تاثرات کی طرح مذہبی ہونا بھی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اور اسے اپنی کسی ساختی ضرورت کی تشفی کے لیے مذہب کی احتیاج ہے ورنہ مذہب اس درجہ عالمگیر مظہر نہ ہوتا۔

مذہب کا نسلیت اور قومیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مذہب کا تعلق ان گروہی علامتوں سے ہے جنہیں قبائل اپنے تشخص کے لیے استعمال کرتے ہیں۔مثال کے طور پر یہودی مذہب کا تعلق صیہونیت اور یہودی قوم پرستی سے ہے۔اور اسی طرح اسلام کا تعلق عرب قومیت پرستی سے ہے۔اور اسی طرح عیسائیت نے بھی بہت سی جنگوں مثلاً صلیبی معرکوں میں نہایت جارحانہ کردار ادا کیا ہے۔ نئی دنیا افریقہ اور ایشیا میں اہل یورپ کو نوآبادیاں بنانے میں ملنے والی کامیابی میں عیسائیت کا دخل ہے۔خود یورپ کے اندر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے درمیان بڑی طویل جنگیں ہوتی رہیں۔جرمنی میں چلنے والی قوم پرستی کی تحریک کا جائزہ بعد میں لیں گے۔اس تحریک نے بھی نیم مذہبی اور نفسیاتی طریقے استعمال کئے اور نازیوں کی پیشرو ثابت ہوئی۔

اپسفلیڈ نے باطل تخصیص کے نام پر جن گروہی اختلافات کا ذکر کیا ہے انہیں اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے تصادم اور کوسووو کی نسل کشی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اس طرح کی تباہ کن جنگیں یورپ میں کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے درمیان ہوئی تھیں۔لبنان کی خانہ جنگی، جنگ عظیم دوم میں یہودیوں اور خانہ بدوشوں کی نسل کشی اور صدام کے عہد حکومت میں کردوں کے خلاف زہریلی گیس کا استعمال سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔تقسیم سے پہلے کے

ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات اور نئی دنیا میں مقامی باشندوں کا قتل عام بھی اسی کی مثالیں ہیں۔غرض یہ کہ فہرست لاانتہا طور پر طویل ہے۔ مذہب اکثر و بیشتر بین المذاہب شادیوں کی ممانعت کرتے ہوئے گروہوں کے مابین فرق کو شدید تر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مذہب کا ایک مثبت کردار بھی ہے جو اس منفی کردار کو متوازن کرتا ہے۔ مذہب بہت حد تک عالمگیر انسانی بھائی چارے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ مذہب کے اس کردار پر مفصل بات چیت باب چہارم میں ہوگی۔

اخلاقیات کے بہت سے عظیم مبلّغ اسی زمانے میں آئے جب انسان شکار اور پھل اکٹھا کرنے کے مرحلے سے گزر کر کاشت کار بن رہا تھا۔اس دور کی ضرورت تھی کہ انسان کو اپنے جبلی رویے پر قابو پانا سکھایا جائے تا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ تعاون کر سکے۔ تبدیلی کے اس دور پر اخلاقیات کے عظیم مبلغین موسیٰ، بدھ، کنفیوشس، سقراط، ارسطو، یسوع اور سینٹ پال کی چھاپ ہے۔ اگرچہ محمد ﷺ قدرے بعد کے زمانے میں آئے لیکن عربوں کے لیے پھر بھی یہ زمانہ وہی تھا جب انہیں تعاون کی حدود کو قبائلی ناتے سے باہر نکالنے کی ضرورت تھی۔

آج کی دنیا میں موجود تمام غالب مذاہب عالمگیر انسانی بھائی چارے کے اصول سے متصف ہیں۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں خطبہ سرکوہ اس کی ایک مثال ہے۔ہمیں اس میں اپنے ہمسائے سے اتنی ہی محبت کرنے کو کہا گیا ہے جتنی ہم خود سے کرتے ہیں۔ ہمسائیگی کی وضاحت کرتے ہوئے یسوع نے کہا کہ مختلف لسانی اور نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ہمارے ہمسائے ہیں۔ خواہ وہ ہم سے کتنے ہی زیادہ فاصلے پر کیوں نہ ہوں۔ عیسائیت کا مطالبہ ہے کہ ہمیں اپنے دشمن کو بھی معاف کر دینا چاہیے۔ اور ایذا دینے والے سے بھی نیکی کرنی چاہیے۔ اگر یہ اصول مان لیا جاتا ہے تو جنگ ممکن نہیں رہتی۔فقط عیسائیت ہی نہیں مت اور عالمگیر انسانیت کے بھائی چارے کے اصول ہندومت، بدھ مت اور اسلام میں بھی موجود ہیں۔

آج کی دنیا کے مذہبی رہنماؤں کے پاس جنگ کے مسئلے میں مثبت کردار ادا کرنے کا موقع موجود ہے کہ وہ عالمگیر بھائی چارے کے تصور کو تقویت دیں، مذہبی گروہوں کے درمیان روابط بنائیں، نسلی حد بندیوں کے مابین شادیوں کو آسان کریں اور گروہی تفرقات کم

MashalBooks.org

کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو انسانیت کو لاحق بحران میں مثبت کردار ادا نہ کر پائیں گے۔

3

قومیت؛ایک باطل مذہب

قبائلیت سے قومیت تک

کوئی چالیس ہزار سال پہلے ہمارے اجداد شکاری تھے یا پھر پھل پھول اکٹھا کرتے ہوئے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کے بڑے سے بڑے گروہ قبائلی تھے۔ قبیلے کے ساتھ وفاداری اور قبائلی منصوبوں پر اجتماعی کام ہمارے اجداد کے لیے عین فطری تھا۔

آج اکیسویں صدی کے آغاز میں ہم قومی ریاستوں میں رہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہماری وفاداری بالکل اس طرح کی ہے جیسی ہمارے اجداد کی اپنے قبائل کے ساتھ تھی۔ نقل وحمل اور ابلاغ کے ذرائع اور جنگ کی تکنیک میں ہونے والی ترقی اور بڑھوتری نے بنیادی سیاسی اور سماجی اکائی کو وسیع تر کردیا ہے۔ مثال کے طور پر یورپ میں توپ جنگی

MashalBooks.org

ہتھیار بنی تو قلعے تباہ ہونے لگے۔ اسی طرح باشاہوں میں فیوڈل نظام کی قیمت پر اپنی تجارت بڑے علاقوں میں پھیلانے کی خواہش جاگی۔ چھاپہ خانہ بنا تو لوگوں کی نسبتاً بہت بڑی تعداد ایک سے اخبار اور کتابیں پڑھنے لگی اور ایک سے جذبات سے متصف ہوئی۔ یوں اس جغرافیائی علاقے کا حجم بڑھ گیا جس کے اندر سیاسی وسماجی ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی تھی۔

ہماری موجودہ صورتحال کا المیہ یہ ہے کہ جن قوتوں نے قبیلے کی جگہ قومی ریاست کو بنیادی سیاسی اور سماجی اکائی بنایا تھا وہی شدّت پکڑ رہی ہیں۔ اسی لیے مکمل طور پر خودمختار قومی ریاست خطرناک صورت اختیار کررہی ہے۔ اگرچہ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت پوری دنیا ایک اکائی کی طرح عمل کرتی ہے لیکن اس کی سیاسی ساخت ٹکڑوں پر مبنی ہے جنہیں ہم خودمختار قومی ریاستیں کہتے ہیں۔ یہ ریاستیں قبائل کے مقابلے میں بہت بڑی ہیں لیکن آج کی ٹیکنالوجی کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹی۔ کیونکہ یہ تمام نوع انساں کو محیط نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایٹمی ہتھیار بنے اور عالمی اقتصادی باہمی انحصار ایک پریشان خواب بن گیا۔ نتیجتاً ہماری تہذیب بین الاقوامی سطح پر موجود انتشار کے ہاتھوں مسلسل خطرے میں ہے۔

اس باب میں ہم یورپ میں قومیت پر بحث کریں گے اور دیکھیں گے کہ خودمختار قومی ریاستوں میں موجود اختلافات نے دو عظیم جنگوں کو کس طرح جنم دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اتنے ہی الم ناک دیگر واقعات کو بھی یاد رکھنا ہوگا جو ان جنگوں کے متوازی وقوع پذیر ہوئے۔ مشرق وسطیٰ کے تنازعات، ویت نام کی جنگ، ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات، جنگ کوریا اور دو خلیجی جنگیں اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان سب المیوں کی بنیاد یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے سبب بین الاقوامی اقتصادی انحصار ایک ٹھوس حقیقت بن چکا ہے لیکن ہمارے سیاسی ادارے، جذبات اور نقطہ ہائے نظر ابھی تک خودمختار قومی ریاست پر مرتکز ہیں۔ اگرچہ ہم یہاں جرمن قومیت پرستی کی مثال پر غور کریں گے لیکن آج یہ بجائے خود کوئی خطرہ نہیں۔ آج کا جرمنی دنیا میں پُرامن ترین اور ذمّہ دار ترین ممالک میں سے ایک ہے اور آج کی دنیا کے امن کو لاحق خطرات بیرون یورپ کی قومیت پرستی سے ہیں۔

یورپ میں قوم پرستی

اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں قومیت پرستی کے بانی عینیت پسند تھے لیکن ان

کی چلائی ہوئی تحریک کے سبب دو عظیم جنگوں میں کوئی ساٹھ ملین لوگ ہلاک ہوئے اور اب بھی قومیت پرستی تیسری عالمی جنگ کی وجوہات میں سے ایک ثابت ہوسکتی ہے۔

یورپی قومیت پرستی روشن خیالی کے دور کا شاخسانہ تھی جس میں فرانسیسی انقلاب اور رومانوی تحریک نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ روشن خیالی کے فلسفے اور انقلابِ فرانس کے تصورات کی رُو سے قرار پایا تھا کہ فقط وہی حکومت جائز ہوسکتی ہے جس کی جڑیں عوام کی رائے میں ہوں۔

1792ء کے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے دانتاں(Danton) نے کہا تھا: ''بطور رکن پارلیمنٹ ہمیں یہاں بھیج کر فرانسیسی قوم لوگوں کی عمومی بغاوت کے لیے ایک عظیم کمیٹی متشکل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔''

چونکہ اب تمام اختیارات قوم کے ہاتھ میں سمجھے جارہے تھے۔ چنانچہ قومی تشخص کا خیال بہت اہم ہوگیا۔ اگرچہ تب کا فرانس لوگوں کے بے شمار گروہوں کا ہجوم تھا اور اس میں نارمن، بریٹن، برگنڈی، فلیمنگ، جرمن، باسک اور کیٹیلان موجود تھے لیکن ان سب کو ازمنہ وسطیٰ سے ہی ایک مضبوط مرکزی حکومت میسر آچکی تھی اور اسی لیے فرانسیسی انقلاب کے بعد یہ لوگ خود کو ایک قوم سمجھنے لگے تھے۔ تاہم جرمنی کو جس شکل میں ہم آج جانتے ہیں تب موجود نہیں تھا۔ فقط چند چھوٹی جاگیردارانہ ریاستیں تھیں جن میں جرمن زبان بولی جاتی تھی۔

فرانس کی سیاسی وحدت نے سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں یورپ پر اس کی ثقافت کو غالب کردیا۔ پَرشیا کا فریڈرک دی گریٹ اور اس کے درباری فرانسیسی زبان بولتے تھے۔ وہ جرمن زبان کو جاہلوں کی زبان خیال کرتا تھا۔ اس نے جب کبھی جرمن بولنا یا لکھنا چاہی کوئی اس کی زبان نہ سمجھ سکا۔ فرانسیسی خواں طبقۂ اشرافیہ سے اور کم تر جرمن خواں متوسط طبقہ تھا اور ان سے بھی نیچے جرمن اور سلاوی خواں دہقان؛ جرمنی میں قومیت پرستی کی تحریک کا آغاز جرمن خواں متوسط طبقے کے نوجوان طالب علموں نے کیا۔ انہیں ماہرین الٰہیات کی حمایت بھی میسر تھی جو چھوٹی جاگیروں کے گھٹے ماحول میں خود کو آزاد نہیں سمجھتے تھے۔ دونوں کو شکوہ تھا کہ فرانسیسی خواں اشرافیہ ان کی صلاحیتوں کو نظر انداز کرتی ہے۔ یہی وہ صورتحال تھی جب نپولین کی فوجیں یورپ پر چڑھ دوڑیں۔ پَرشیا اور آسٹریا دونوں کو رُسوا کن شکست

ہوئی۔ تب جرمن نوجوانوں نے خود سے پوچھا کہ وہ کونسی شے ہے جو فرانسیسیوں میں ہے اور ان میں نہیں۔

جواب کچھ بہت مشکل نہیں تھا۔ فرانسیسیوں میں قومی تشخص کا احساس موجود تھا۔ دراصل انقلابِ فرانس نے اہلِ فرانس کے اندر مدت سے سوئی قبائلی جبلتوں کو جگا دیا تھا۔ جرمن قومیت کے علمبرداروں نے نتیجہ اخذ کیا کہ اگر انہیں فرانس کو شکست دینا ہے تو اپنے لوگوں میں اسی جنون کو جگانا ہوگا۔ انہوں نے خیال کیا کہ انہیں بھی اپنے لوگوں میں انسانی فطرت کے اس فراموش کردہ تار کو چھیڑنا ہوگا جسے انقلاب فرانس نے دریافت کیا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف کے یورپ میں فوج کے اہم سپاہی جنگ میں جذباتی طور پر ملوث نہیں ہوتے تھے۔ انہیں معاشرے کے کمترین طبقے سے بھرتی کیا جاتا تھا۔ اور وہ کسی بادشاہ یا شہزادے کی فوج میں تنخواہ کے لیے شامل ہوتے تھے۔ فرانسیسی انقلاب نے یہ سارا منظر نامہ بدل دیا۔ 1792ء میں فرانسیسی قانون ساز اسمبلی نے قرار دیا کہ ''ہر کمیون میں ایک فادر لینڈ آلٹر (Altar) نسب کی جائے اور اس پر لکھ دیا جائے کہ ایک شہری اپنے وطن کے لیے پیدا ہوتا، جیتا اور مرتا ہے۔'' یوں پتہ چلتا ہے کہ فرانسیسی انقلاب نے کس طرح ایک نیم مذہبی تحریک کی حیثیت سے تقویت پکڑی تھی۔

نپولین کے فوجی کسی طرح کی رقم کے لیے نہیں لڑ رہے تھے۔ ان کی لڑائی ایک آئیڈیل کے لیے تھی جسے وہ اپنی ذات سے بڑا اور اہم خیال کرتے تھے یعنی ''فرانس کا شکوہ''۔ ہمیشہ سے سیاسی معاملات سے باہر چلے آنے والے عوام جو کبھی فقط اپنے دیہی معاملات تک محدود رہتے تھے بڑے پیمانے کے سیاسی عمل میں شامل ہو گئے تھے۔ فرانس میں قومیت پرستی کے جذبات دراصل بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہونے والے قبائلی جذبات تھے۔ یہ ایک ایسی قبائلیت تھی جسے ابلاغ کے نئے ذرائع نے بے مثال بلند آہنگ دیا تھا۔

یہی وہ مذہب تھا جس نے جرمن قوم پرستوں کو متاثر کیا۔ جرمن قوم پرستوں میں سے ایک معروف فلسفی ایمانویل کانٹ (1724-1804) کا پیروکار جان گاٹلب فشٹے بھی تھا۔ اس نے اخلاقیات کے معروضی پیمانے اور معیار کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ فرد کی وقعت سے بھی انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ فرد کچھ نہیں اور ریاست سب کچھ ہے۔ اس نے فرد کی وقعت سے انکار کرتے ہوئے قرار دیا کہ ریاست ایک جاندار ہے جبکہ فرد اس کا صرف ایک

MashalBooks.org

حصہ۔ فشٹے نے لکھا:

''فطرت نے کوئی ایسی چیز نہیں بنائی جس میں کوئی جزو اپنے کل سے ایک سی وقعت کا حامل ہو۔ جزو کی وقعت فقط اس کے تعلق سے ہے۔ خاص طور پر اگر جزو کا کوئی نامیاتی تعلق نہیں تو پھر یہ کچھ نہیں۔ اس لیے کہ چیزوں کے باہم متوازن رکھنے والی نامیاتی قوتوں کے درمیان ہونے والے عمل اور ردعمل کے بغیر کوئی شکل برقرار نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح اشیا کے منصوبے میں انسان کو ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اور یہ فطرت میں فقط اپنی خاصیت تعلق کے ذریعے ہی متداخل ہوسکتا ہے۔ اکیلے شخص اور ریاست کے شہری کے درمیان وہی تعلق ہے جو خام اور منظم مادے کے درمیان ہے۔ منظم جسم کے اندر ہر جزو کل کو برقرار رکھتا ہے اور اس عمل میں خود اپنا استقرار کرتا ہے۔ ریاست کے ساتھ شہری کا تعلق بھی یہی ہے۔

کانٹ کے بعد کا ایک اور فلسفی ایڈم مولر(1779-1829) لکھتا ہے،''ریاست کسی پوری قوم کی تمام جسمانی اور روحانی ضروریات کو ایک عظیم، توانا اور لامحدود طور پر سرگرم زندہ وجود کی شکل دیتی ہے جسے انسانی معاملات کی کلیت کہا جاسکتا ہے۔ اگر ہم انسان کے کسی انتہائی غیر اہم جزو کو بھی اس تعلق سے ہمیشہ کے لیے نکال دیں اور کسی ایک جگہ بھی عوامی اور نجی زندگی کو الگ کردیں تو پھر ریاست بطور حیاتیاتی مظہر موجود نہیں رہے گی اور نہ ہی بطور تصور۔''

اس پیراگراف میں ایڈم مولر کے پیش کردہ اصول کو آج کی سیاسی اصطلاح میں کلیت پسندی کہا جائے گا یعنی یہ خیال کہ ریاست کو انسانی معاملات کا بطور کل احاطہ کرنا چاہیے۔ یہ اصول آزاد خیالی کے متضاد ہے جو قرار دیتی ہے کہ فرد اہم ترین ہے اور ریاست کا کردار ہر ممکن حد تک کم ہونا چاہیے۔ اسے اب کلیت پسندی کہا جاتا ہے یعنی یہ ایقان کہ ریاست کو محیط کل ہونا چاہیے اور تمام انسانی معاملات کی کلیت پر اس کی دسترس ہونی چاہیے۔ یہ اصول آزاد خیالی کے اس اصول کے ساتھ متصادم ہے کہ فرد اہم ترین ہے اور ریاست کا کردار ہر ممکن حد تک کم ہوجانا چاہیے۔ فشٹے سمجھتا ہے:

''اندرونی قوت کی طالب ریاست کو چاہیے کہ تمام شہریوں کو برابر کے حقوق دے اور بتدریج ہر طرح کی مراعات کا خاتمہ کردے۔ اسی طرح ریاست اپنے تمام شہریوں کی اضافی قوت کو بغیر کسی استثنا کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرسکے گی۔ اندرونی امن اور وہ

حالات کہ ہر کوئی اپنے ذرائع معاش کے لیے سرگرم ہو سکے محض ایک ذریعہ ہے جو مادر وطن کی محبت کا تقاضا ہے اور اسی طرح ابدی اور الوہی اصول اس دنیا میں پھل پھول سکتے ہیں۔ اس کا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔''

فشٹے نے ایک نیا نظام تعلیم بھی تجویز کیا جو انفرادی ادارے کو ختم کر دے گا اور فرد ریاستی ادارے کے تابع ہو جائے گا۔ فشٹے اور ہرڈر(Herder)[1740-1803] نے ایک نظریہ وضع کیا کہ زبان قومی تشخص کی ایک کلید ہے۔ دونوں کا خیال تھا کہ چونکہ جرمن لاطینی سے ماخوذ نہیں اور بجائے خود اصل زبان ہے چنانچہ یہ فرانسیسی زبان سے برتر ہے۔ ہرڈر نے فرانسیسی تمدن کی برتری کے خلاف کئی منظوم احتجاج کئے۔ دیگر کئی جرمن شاعروں نے بھی پرشیا کے دربار میں فرانسیسی تمدن کے تسلط پر طعن آمیز نظمیں لکھیں۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب یہ شاعری ہو رہی تھی تو جرمن قوم فقط ان قوم پرستوں کے ذہن میں موجود تھی۔ مختلف لہجوں میں جرمن بولنے والے لوگوں کے گروہ پورے وسطی اور یورپی شہروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ کئی جگہوں پر جرمن خواں آبادی اقلیت میں تھی۔ ان جرمن خواں گروپوں کو ملا کر ایک قوم بنانے کے لیے سلاوی اقلیتوں کو فتح اور مطیع کرنا ضروری تھا۔ قوم پرستی کے نیم مذہبی جذبے نے اس ضرورت کو مقدس جنگ کا روپ دیا۔ فشٹے سمجھتا تھا،''ریاستوں کے درمیان ہونے والی جنگ تاریخ میں زندگی اور پیش قدمی کا اصول متعارف کرواتی ہے۔''اس کے نزدیک جنگ بین الریاستی محدود لڑائی نہیں بلکہ ایک ایسی بڑی جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں کوئی ایک قوم مطیع ہو جاتی ہے۔ جرمن قوم پرست تحریک کا فقط لہجہ ہی نیم مذہبی نہیں تھا بلکہ اس نے مذہب کے نفسیاتی حربے بھی مستعار لیے۔ اس نے اسطورہ اور علامت استعمال کرتے ہوئے لوگوں میں بڑے پیمانے کی سیاسی سرگرمی متعارف کروائی۔

1814ء میں چھپنے والی اپنی کتاب''جرمن سوسائٹی'' میں آرنٹ (Arnts) نے مقدس تہوار منانے کی پُر زور وکالت کی ہے۔ مثال کے طور پر وہ قرار دیتا ہے کہ مسیحیت سے پہلے کا ایک بھاری تہوار مناتے ہوئے اس میں نپولین پر فتح کی یادگار کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ وہ قرار دیتا ہے کہ جرمنی کی جنگوں میں مرنے والوں کی یاد کبھی ذہنوں سے محو نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یوں''تاریخ زندگی میں داخل ہوتی ہے اور زندگی تاریخ کا حصہ بنتی ہے۔'' آرنٹ نے

مسیحی اور پیگن (Pagan) علامتیت کو باہم ملانے کی بات بھی کی ہے۔ وہ کہتا ہے، ''تہوار دعا، چرچ اور سروس سے شروع ہو سکتے ہیں لیکن ان میں پیگن روایت کے مقدس شعلوں اور اوک کے پتوں کو بھی شامل کیا جائے۔

1815ء میں لیپزگ کی لڑائی کی سالانہ یادگاری تقریب منائی گئی تو آرنٹ کی کئی تجاویز پر عمل ہوا۔اس میں کئی مسیحی عناصر کو دنیاوی علامتوں کے ساتھ ملا کر قومی کلٹ (Cult) وضع کئے گئے۔عورتوں اور مردوں کی ایک بھاری تعداد نے اوک کے پتے جسموں پر سجائے اور زیارت کے لیے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہنچے جہاں قربان گاہوں کے سامنے موجود پادریوں نے جرمنی کی آزادی کے مقدس شعلے جلا کر ان سے خطاب کیا۔ مذہب سے نفسیاتی تکنیک مستعار لینے کا یہ عمل بڑا سوچا سمجھا تھا۔ نازی پارٹی نے بھی اوّلین جرمن قوم پرستوں کے ان طریقوں کو اپنائے رکھا۔نازیوں نے بڑے پیمانے کے جلوس نکالے اور ان میں رہنما اور حاضرین کے درمیان تعلق کو اجتماعی نظم وضبط کی صورت پیش کیا۔*

1832ء میں جرمن تاریخ کا پہلا عوامی اجتماع ہوا۔کوئی بتیس ہزار مرد و زن جرمن مئی منانے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ سیاہ، سرخ اور نقرئی نشان اٹھائے، جھنڈے لہرائے، گیت گاتے اس ہجوم نے ہیمبر یک (Hembrach) کیسل تک مارچ کیا جہاں ان کے رہنما خطاب کرنے کے لیے موجود تھے۔

انیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی تک قومیت پرستی کے یہ مظہر باقاعدہ متشکل ہو چکے تھے۔ ان تقریبوں میں قوم پرستی کے نغمے کورس کی شکل میں گائے جاتے، ڈرامے کھیلے جاتے، جمناسٹک اور دوسرے کھیل کھیلے جاتے۔تمام کھلاڑیوں کے لیے خاص طرح کی وردی ضروری تھی۔تقریباً سب حاضرین اپنی ٹوپیوں میں اوک کے پتے سجاتے۔حاضرین کی ہم آہنگی فقط یونیفارم سے ہی ظاہر نہ ہوتی بلکہ میلے کی جگہ بھی اسے تقویت دیتی۔ آرنٹ نے عوامی اجتماع کی جگہ کو مقدس مکاں قرار دیا تھا۔ مکاں کی تقدیس کا یہ تصور جرمنی میں موجود سٹون ہینگ (Stone Henge) سے لیا گیا جسے جرمن قوم پرست قدیم جرمانی اجتماع گاہ قرار دیتے تھے۔

قومی آہنگ اور تشخص کے جذبات کی ترویج کے لیے خواب بھی استعمال ہوئے۔ کلیسٹ (Kleist) کا ایک ڈرامہ "Battle" مطبوعہ 1808ء اس طرح کے پروپیگنڈے کی ایک مثال ہے۔ ڈرامے میں ایک جگہ ہرمان کو بتایا جاتا ہے کہ ایک رومن

سپاہی نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر ایک جرمن بچے کو جلتے گھر میں سے نکالا ہے۔ یہ سن کر ہرمان کہتا ہے، ''اُس نے یہ کیا ہے تو اُس کا بُرا ہو۔ اُس نے ایک لمحے کو میرا دل میرے

* نازیوں کی مقدس علامات، سواستیکا کی علامت، سرخ، سیاہ اور سفید رنگوں کی کلر سکیم، ایک قدیم نارڈی نشان جو بعد ازاں نازی خفیہ پولیس کی علامت بنا، سب کے سب صدیوں پرانے مرتاضی روایات سے اختیار کیے گئے ہیں۔ یہ علامات دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مرتاضی فرقے استعمال کرتے تھے۔

مقصد سے ہٹا دیا۔ میرے دل کو جرمنی کے لیے عظیم لگن سے بھٹکا دیا۔ انتقام کے دیوتاؤں کی قسم۔''

کھیل میں ایک اور جگہ ہرمان کی بیوی ایک رومن عہدیدار کو لبھا کر باغ میں بلاتی ہے۔ باغ میں آنے پر اس رومن کو شربتِ وصل کی بجائے ایک بھوکی ریچھنی سے واسطہ پڑتا ہے۔ باغ کے باہر کھڑی ہرمان کی بیوی باغ میں محصور رومن کو ریچھنی کے غضب کا نشانہ بنتے دیکھتی اور فرطِ لذّت سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔

رچرڈ ویگنر کے ڈرامے بھی قوم پرست تحریک کا حصہ تھے۔ یہ ڈرامے قوم پرستی پر مبنی القا کے خواب ناک ماحول پر مشتمل تھے۔ ڈراموں میں تالی بجانا منع تھا کہ تقدس میں فرق نہ آئے۔ اس طرح کے ڈرامہ نگاروں کا خیال تھا کہ وہ اپنے ناظرین کو فرد نہیں بلکہ ایک پوری کمیونٹی کے مقدر کے متعلق تعلیم دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ انفرادیت فقط بورژوا تھیٹر کا حصہ ہے اور لوک تھیٹر میں ٹائپ پر غور ہونا چاہیے۔

اگرچہ ہمارا مرکزی موضوع جرمن قوم پرستی کا ارتقا ہے لیکن ذہن میں رکھنا ہوگا کہ یورپ کے دیگر حصوں میں بھی اس طرح کی تحریکیں اٹھ رہی تھیں۔ ان سب تحریکوں میں ایک عنصر مشترک تھا کہ ریاست کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنایا جائے اور لوگ اسے ایک نیم مذہبی تقدیس کا حقدار خیال کریں۔ حب الوطنی ایک مقدس فرض بنتی جا رہی تھی۔ ہیگل نے قرار دیا، ''ریاست کی موجودگی اس دنیا میں خدا کا چلن ہے۔ یہ اس کرۂ ارض پر حتمی مقتدرہ ہے۔ یہ خود اپنا جواز ہے اور خود ہی اپنا معروض۔ یہ بجائے خود ایک مقصد ہے اور اِسے فرد پر مطلق حقوق حاصل ہیں۔''

جرمنی کی طرح انگلینڈ میں بھی قومیت پرستی بڑی حد تک فرانسیسی قومیت پرستی کا ردِعمل تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں انگلینڈ میں روشن خیالی پھیل چکی تھی۔ اہلِ انگلینڈ میں

انقلاب فرانس کے اغراض ومقاصد کے لیے ہمدردانہ رویہ موجود تھا اور یہاں بھی اسی طرح کا انقلاب آنے کو تھا۔ تاہم جب نپولین نے آئرلینڈ میں فوج اتاری اور انگلینڈ پر حملے کی دھمکی دی تو ردعمل کے طور پر قومی دفاع کا جذبہ ابھرا۔ فرانس کے خلاف جنگ نے انگلینڈ میں قوم پرستی کو تقویت دی اور ولنگٹن اور نیلسن جیسے فوجی ہیرو نیم مذہبی پرستش کے حق دار قرار پائے۔ یہی برطانوی قوم پرستی بعدازاں نوآبادکاری کے جنون میں ظاہر ہوئی۔

جرمنی کی طرح اٹلی بھی چھوٹی چھوٹی جاگیروں کا مجموعہ تھا۔ یورپ میں جاری قوم پرستی کی تحریکوں کے سبب یہاں بھی متحدہ اٹلی کی تحریک چلی۔ یورپ میں قوم پرستی کی مختلف تحریکوں کے باہمی تصادم نے بیسویں صدی کی خوف ناک جنگوں کو جنم دیا۔ سربوں میں چلنے والی قوم پرستی کی تحریک پہلی جنگِ عظیم کا نقطۂ آغاز بن گئی۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے قوم پرستوں کو اندازہ نہیں تھا کہ جنگیں ایسی تباہ کن بھی ہوسکتی ہیں۔ تب بیسویں صدی میں بننے والے خوف ناک ہتھیاروں کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس صدی میں خلائی عہد کی سائنس اور پتھر کے زمانے کی سیاست کا جو امتزاج نظر آتا ہے انیسویں صدی میں اس کی پیش بینی نہیں ہوسکتی تھی۔ تاہم 1834ء میں ایک جرمن مصنف ہنریک ہائنے (Heinrich Heine) نے لکھا، ''آنے والی دنیا میں کانٹ کا پیروکار حق کی تعظیم سے عاری ہوگا اور بڑی بے رحمی کے ساتھ ہر دستیاب ہتھیار لے کر یورپ کی سرزمین سے ماضی کی جڑیں کھودڈالے گا۔ فشٹے کے پیروکار اسلحے سے مسلح زمین پر پھیلیں گے اور عزم کے جنوں میں خوف یا ذاتی مفاد دونوں سے بے نیاز ہوں گے کہ وہ جذبے میں زندہ ہیں۔''

دو عظیم جنگیں

1870ء میں پَرشیا کے قوم پرست چانسلر بسمارک نے نپولین بونا پارٹ کے ہاتھوں ہونے والی اپنے ملک کی تذلیل کا بدلہ لے لیا۔ جدید اسلحے سے مسلح پَرشیا کی فوجوں نے فرانس کو روند ڈالا اور اس کے بادشاہ نپولین سوم کو قیدی بنالیا۔ پَرشیا نے فرانس سے پانچ بلین فرانک کے تاوانِ جنگ کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی فرانس کے دوصوبوں لورین اور اساس کے پَرشیا کے ساتھ الحاق پر زور دینے لگا۔

MashalBooks.org

1871ء میں ولہیلم اوّل کو تمام جرمنی کا شہنشاہ قرار دیا گیا۔ اُس دن جرمن قوم پرستوں کے خواب پورے ہوئے۔ وسطی یورپ کی جرمن خواں چھوٹی چھوٹی ریاستیں متحد ہو کر ایک بڑی ریاست میں بدل گئیں جن پر پَرشیا کا تسلط تھا۔ جرمنی کو متحد کرنے کے لیے بسمارک نے کئی جنگیں چھیڑیں۔

1871ء کے بعد بسمارک امن کا طالب ہوا۔ اُسے لگتا تھا کہ مزید جنگیں اس کی تخلیق کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہیں۔ بسمارک اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، ''سب بڑے کام ہو چکے۔ میں بے کیف ہو رہا ہوں۔ جرمن سلطنت بن چکی ہے۔''

یورپ میں جرمن تسلط کی صورتحال کو برقرار رکھنے کے لیے بسمارک نے نہ صرف آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کے ساتھ تعلقات بنائے بلکہ روس کے ساتھ بھی معاہدے کئے۔ ان ریاستوں کو بھی جزیرہ نما بلقان پر تسلط کا دعویٰ تھا۔ انہیں رام کرنے کے لیے بسمارک کو سفارت کاری کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ ہیپسبرگ گھرانہ اور روس دونوں ترک سلطنت کے تسلط سے نکلنے والے علاقوں پر غالب آنا چاہتے تھے لیکن ان علاقوں میں بھی قوم پرستی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ انیسویں صدی کے یورپی قوم پرستی کو سب سے بڑا مقصد جانتے تھے اور اس کے لیے ایک دوسرے کو اسی طرح ہلاک کرنے پر آمادہ رہتے تھے جس طرح پچھلی صدیوں میں وہ مذہب کے نام پر باہمی ہلاکتیں کرتے چلے آئے تھے۔ سربیا ایک خودمختار ریاست تھی لیکن یہاں کے قوم پرستوں کو بھی تسلی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آسٹریا۔ ہنگری کے سلاوی حصوں کو ملا کر ایک بڑی اور آزاد سرب سل (یوگوسلاویہ) تشکیل دیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بلقان اسی طرح کا پُر انتشار علاقہ تھا جس طرح آج کی دنیا میں مشرق وسطیٰ ہے۔ قیصر ولہیلم خاصا مستحکم حکمران تھا۔ 1888ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا قدرے آزاد خیال بیٹا فریڈرک سوم تخت پر بیٹھا۔ کینسر میں مبتلا یہ بادشاہ صرف نوّے دن کے بعد مر گیا اور اس کا 29 سالہ بیٹا جرمنی کا بادشاہ بنا۔ یہ بادشاہ قیصر ولہیلم ثانی شدید قدامت پسند تھا اور اسے لڑکپن سے ہی بتایا گیا تھا کہ وہ غضب کا لڑاکا بنے گا۔

1890ء میں ولہیلم نے اوٹووان بسمارک کو اقتدار سے نکال دیا۔ دراصل اب بسمارک امن چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے یورپ کی متلاطم سیاست میں سے جرمنی کو

بحفاظت نکالنا ہے۔ اگر اسے موقع ملتا تو غالباً اس کی حکمتِ عملی یہی ہوتی۔ لیکن نیا بادشاہ بسمارک کے حصے کے فیصلے بھی خود کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک نیا بسمارک ثابت ہو سکتا ہے۔ ولہیلم نے سب سے پہلے روس کے ساتھ موجود اتحاد توڑ ڈالا۔ اس پر زار روس الیگزینڈر سوم نے اپنے اصولوں کے خلاف فرانس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ ولہیلم نے اپنی غلطی کا ادراک کرتے ہوئے تعلقات کی تجدید چاہی۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ اس وقت کا یورپ دو بڑے مسلح کیمپوں میں بدل گیا۔ ایک طرف جرمنی، آسٹریا-ہنگری اور اٹلی تھے اور دوسرے کیمپ میں روسی اور فرانسیسی۔ تب ولہیلم کی حکومت نے ایک بہت بڑی بحریہ بنانا شروع کی تاکہ انگریزوں کا ناطقہ بند کیا جا سکے۔ دفاع کے لیے بحریہ پر انحصار کرنے والی انگریزی حکومت نے بھی یہ تیاری بھانپ لی۔ 1871ء میں متحد ہونے کے بعد جرمنی نے تیز رفتار صنعتی ترقی کی تھی۔ جرمن صنعت فولاد اور نہایت عمدہ کوالٹی کی دیگر چیزیں پیدا کر رہی تھی۔ عالمی تجارت پر برطانوی تسلط کو جرمن چیلنج صاف نظر آنے لگا تھا۔

اسی اثنا میں بلقان کی صورتحال بگڑنے لگی۔ جولائی 1914ء کے اواخر میں آسٹریا کے وزیرِ خارجہ کاؤنٹ بریک ٹولڈ (Brechtold) نے آرک ڈیوک فرڈیننڈ اور اس کی بیوی کے قتل کا بہانہ بنا کر سربوں کی توسیع پسندی کی تحریک کو کچلنے کا اعلان کر دیا۔ سربوں کے دفاع میں روس متحرک ہوا تو آسٹریا کی حکومت نے اسے جنگ کا اعلان سمجھا۔ معاہدہ کی رو سے جرمنی آسٹریا کے ساتھ وابستہ تھا اور فرانس روس کے ساتھ۔ یوں فرانس اور روس دونوں اس تنازعہ میں گھسٹ آئے۔

2 اگست کو ولہیلم نے مطالبہ کیا کہ بلجیم اس کی فوج کو گزرنے کا راستہ دے۔ بلجیم نے انکار کیا اور انگلینڈ سے درخواست کی کہ ان کی غیر جانبداری کی حمایت کی جائے۔ 4 اگست کو برطانیہ نے قیصر کو جنگ کا الٹی میٹم بھجوا دیا کہ اگر بلجیم پر حملہ ہوا تو اس کا دفاع کیا جائے گا اور یوں جنگ کا مومینٹم مزید تیز ہو گیا۔

سر ایڈورڈ گرے نے افسوس ناک پیش گوئی کی، ''پورے یورپ میں دیے بجھ رہے ہیں اور ہم اپنے دورِ حیات میں انہیں جلتا نہیں دیکھیں گے۔''

جنگ عظیم اوّل چھیڑنے والوں کو اندازہ نہیں تھا کہ معاملات یہ رخ اختیار کریں گے۔ یورپ کی افواج پر پرانی جاگیردار جماعت کا تسلط تھا جن کے جنگی رویے کی جڑیں ازمنہ وسطیٰ

میں تھیں۔ یورپ کے سفارت کار حلقوں پر کاؤنٹوں اور بیرنوں کی اجارہ داری تھی جنہیں شیمپئن پینے، رقص کرنے، گھوڑے دوڑانے اور عورتوں پر ترغیب آزمائی کرنے کے سب گر آتے تھے۔ انہوں نے بڑے جذبوں کے ساتھ وردیوں پر جگمگاتے طلائی تمغے لگائے جنگ کا آغاز کیا۔ ان لوگوں کو کیولری کے ہلّوں میں رومان انگیز شجاعت نظر آتی تھی، مفتوحہ دیہات کی خوبصورت لڑکیوں کے بوسوں کی تمنا تھی اور تمغوں اور ترقیوں کی خواہش تھی۔ یہ سب کردار ''چاکلیٹ سولجر'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

لیکن جب جنگ چھڑ گئی تو اس کا رنگ ڈھنگ ہی اور تھا۔ اس پر ٹیکنالوجی حاوی ہو گئی۔ ریل روڈ، ٹیلی گراف، طاقت ور دھماکو مواد اور مشین گن نے ہر چیز بدل کر رکھ دی۔ متحارب افواج ٹیلی گرافوں کی صدا پر ریلوے کے ذریعے حرکت کرتی رہیں۔ اِس جنگ کے محاذ تاریخِ عالم کے پُر ہجوم ترین محاذ تھے۔ اکیلے فرانس نے 2 اگست سے لے کر 18 اگست 1914ء میں ریلوے نظام میں فوجی احکامات کے تحت 37,81,000 لوگوں کو ایک سے دوسری جگہ پہنچایا۔ ساٹھ لاکھ لوگ ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے لیے ریلوے کی پٹریوں پر متحرک ہوئے۔ اس پیمانے کی نقل وحمل پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور کسی کو پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا۔

جب قیصر ولہیلم نے اپنے دستے میدان جنگ کو روانہ کئے تو اس نے انہیں بتایا تھا، ''درختوں کے پتے گرنے سے بھی پہلے آپ لوگ گھروں کو لوٹ آئیں گے۔'' پہلے پہل اس کی پیشگوئی درست نظر آتی تھی لیکن مشین گن نے جنگ کی نوعیت ہی بدل ڈالی تھی۔ مشین گن سے مسلح تھوڑے سے لوگ گھڑ سوار حملہ آوروں کو کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔ چونکہ دفاع کو حملے پر فوقیت مل گئی۔ چنانچہ جنگ کا فیصلہ کن ہونا مشکل ہوگیا۔ مغربی محاذ پر متحارب فوجوں نے بحر اوقیانوس سے لے کر سوئٹزرلینڈ کی سرحد تک خندقوں کا ایک پورا سلسلہ کھود ڈالا جن کے درمیان خاردار تار کے چھلے تھے۔ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی جنرل کے حکم پر یہ دستے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ لاکھوں گولے چلتے۔ پہلے تاریں کاٹی جاتیں اور پھر سپاہی مورچوں سے نکل کر سامنے کے مورچوں پر جا پڑتے۔

حملہ آور دھوئیں کا سہارا لیتا اور دفاع کرنے والا مشین گن کا۔ ان کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں تھا۔ حکم عدولی پر کورٹ مارشل ہوتا اور بھگوڑا قرار دے کر گولی ماردی جاتی۔ فوجی

انہی حملوں میں بیکار کٹتے رہے۔لڑائی کسی نتیجے پر نہ پہنچی۔اس کی ذمہ داری ان کے رہنماؤں پر تھی جو ناکام ہو چکے تھے اور ان کی تہذیب پر تھی جو اس جنگ کا سبب بنی تھی۔ورڈن (Verdun) کی جنگ میں سات لاکھ نوجوان مارے گئے۔سوم (Somme) کی لڑائی میں گیارہ لاکھ کھیت رہے۔متحارب فوجوں کے اپنے اپنے رزمیہ گیت تھے۔کروڑوں لوگ کٹ مرے۔انتظار کرتے گھر والوں کو فقط ایک ٹیلی گرام پر ان کے کسی نہ کسی عزیز کی موت کی خبر ملتی تھی۔

چار سال کے بعد جنگ ختم ہوئی تو ایک کروڑ فوجی مر چکے تھے، دو کروڑ زخمی ہوئے تھے جن میں سے ساٹھ لاکھ ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گئے تھے۔1919ء میں لگائے گئے تخمینے کے مطابق یہ جنگ تین کھرب پچاس ارب ڈالر میں پڑی۔ یہ فقط مالیاتی نقصان کا تخمینہ تھا۔ انسانی ابتلا اور اقدار کی پامالی کا حساب نہیں لگایا جا سکتا تھا۔اس سے کچھ حاصل نہ تھا کہ جنگ کس کی حرکت سے شروع ہوئی۔ دوسروں کے مقابلے میں شائد آسٹریا کی حکومت پر زیادہ الزام رکھا جاتا ہے۔اس کے باوجود آسٹریا کے لوگ بہر کیف جنگ کے ذمہ دار نہیں تھے۔ اِس جنگ کا بڑا المیہ یہ تھا کہ اس نے متحارب اقوام کے مابین لمبے عرصے تک باقی رہنے والی تلخیوں کو جنم دیا۔

جنگ عظیم اوّل کے نتیجے میں چار بادشاہوں کو زوال آیا۔ روسی زار، ترک سلطان، آسٹریا اور ہنگری کے شہنشاہ اور جرمن قیصر۔انحطاط پذیر اور غیر منصفانہ زار حکومت کو سالوں سے انقلاب کا خطرہ لاحق تھا۔جنگ کی تباہ کاری سے دوچار ہونے کے بعد لوگ فیصلہ کُن طور پر اس کے خلاف ہو گئے۔صرف 1915ء میں روس کے 20 لاکھ افراد مارے گئے یا گرفتار ہوئے۔

بالآخر روسی سپاہیوں نے خود اپنے افسروں کو گولیاں مارنا شروع کر دیں۔ فروری 1917ء میں زار کو معزول کیا گیا اور 5 دسمبر 1917ء کو روس کی نئی کمیونسٹ حکومت نے جرمنی کے ساتھ جنگ بندی پر دستخط کر دیئے۔اب جرمن چیف آف سٹاف جنرل لڈنڈورف (Lydendorf) نے اپنے سارے دستے مغربی محاذوں پر لگا دیئے۔

مارچ 1918ء میں اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا۔ جون میں یہ لوگ پیرس سے صرف 50 کلومیٹر کے فاصلے پر مارنے (Marnew) میں پہنچ چکے تھے۔ اسی اثنا میں

اتحادیوں کو امریکی دستے اور ٹینک میسر آ گئے۔ اب جرمن پسپا ہونے لگے۔ اگلے چھ مہینوں میں ان کے دس لاکھ لوگ مارے گئے۔ جرمن فوج کے حوصلے ٹوٹے۔ اُن دنوں ہر مہینے اڑھائی لاکھ امریکی فوجی فرانس میں اتر رہے تھے۔ لڈنڈورف کو احساس ہو گیا تھا کہ جرمنوں کی تمنّا پوری ہونے کی اُمّید نہیں رہی اور اگر فوری امن قائم نہیں ہوتا تو روس کی طرح جرمنی میں بھی کمیونسٹ انقلاب آ جائے گا۔ پُرشیا پر غالب قدیم فوجی طبقے نے اس ملک کو جنگ میں دھکیلا تھا اور اب وہ اس کی ذمہ داری روشن خیال طبقوں پر ڈالنا چاہتا تھا۔ لڈنڈورف نے قیصر کو تخت سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیا۔ ایک لبرل رہنما پرنس میکس کو نئی حکومت کا سربراہ بنایا گیا۔ 9 مئی 1918ء کو جرمنی ایک جمہور یہ قرار پایا۔ دو دن کے بعد جنگ بندی پر دستخط ہوئے اور لڑائی رکی۔

جنگ کے آخری سالوں میں قوت کی سیاست اور قوم پرستی کے لالچ سے تھکے ہارے لوگ امریکی صدر ووڈرو ولسن کی عینیت پسندی سے اُمّید لگانے لگے تھے۔ اس نے اپنے مشہور چودہ نکات پر مبنی بغیر فتح کے امن کی تجویز پیش کی تھی۔ خود ولسن یہ سمجھتا تھا کہ اس کے پیش کردہ نکات میں سے آخری اہم ترین ہے۔ ولسن نے اِس آخری نکتہ میں زور دیا تھا کہ ''اقوام کی ایک قومی ایسوسی ایشن قائم کرنا لازمی ہے تاکہ قومیں ایک دوسرے کی سیاسی آزادی کی ضمانت دے سکیں اور چھوٹی بڑی ریاستوں کو یکساں طور پر اپنی علاقائی سلامتی کی ضمانت حاصل رہے۔''

جب ولسن امن کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ پہنچا تو اس کی عینیت پسندی کو امید کی کرن سمجھنے والے عام لوگوں نے اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا۔ بدقسمتی سے جنگ کے چار سالوں کی پیدا کردہ نفرت اتنی زیادہ تھی کہ اس پر قابو پانا مشکل تھا۔ امن کانفرنس کے دوران بھی عمر رسیدہ قوم پرست رہنما جارجز کلامینسیو جرمنی کے خلاف اپنی نفرت چھپا نہیں پایا۔ اس جنگ کے دوران فرانس کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ بیس سے بتیس سال تک کے فرانسیسی مردوں میں سے نصف ہلاک ہو چکے تھے۔ اس کا بیشتر دیہی علاقہ تباہ ہو چکا تھا۔ پسپا ہوتی جرمن فوج نے ان کی کوئلے کی کانیں برباد کر دی تھیں۔ کلامینسیو تلا ہوا تھا کہ جرمنوں سے بدلا لے گا اور انہیں مالی تاوان بھی ڈالے گا۔

بالآخر ہونے والا امن کا معاہدہ ایک مفاہمت ثابت ہوا۔ ولسن کو اس کے خوابوں کی

تعبیر ''جمعیتِ اقوام'' کی صورت ملی۔ کلامینسیو کا اصرار مانتے ہوئے جرمنی کو جنگ شروع کرنے کی تمام ذمہ داری قبول کرنا پڑتی تھی۔ وہ مجبور ہوجاتا کہ قیصر اور اپنے دیگر رہنماؤں کو جنگی مجرموں کے طور پر مقدمہ چلائے جانے کے لیے اپنے حریفوں کے حوالے کردے۔ اسے دورانِ جنگ ہونے والے تمام عالمی نقصان کی تلافی کرنا تھی۔ جرمن دریاؤں کو بین الاقوامی حیثیت دینا تھی۔ طے پایا تھا کہ جرمنی فرانس، بلجیم اور اٹلی کو تاوان جنگ کے طور پر سالانہ 25 ملین ٹن کوئلہ دے گا، کوئلے کی کانوں والے علاقے السیس-لورین* فرانس کے حوالے کرے گا، بیرونِ ملک واقع اپنی تمام کالونیاں چھوڑ دے گا، بیرونِ ملک موجود تمام جرمن املاک سے دستبردار ہوگا اور رائن لینڈ پر اتحادیوں کا قبضہ پندرہ سال تک برقرار رہے گا۔

کوئلے سے دستبرداری کا مطلب تھا کہ جرمنی اپنی صنعت تباہ کرلے۔ معاہدہ کی شرائط پڑھنے کے بعد جرمن چانسلر چلّا اٹھا، ''خدا کرے اس طرح کے امن پر دستخط کرنے والے کا ہاتھ جھڑ جائے۔'' جرمن وزیر خارجہ نے بھی اس پر دستخط سے انکار کیا اور جرمن حکومت نے یہ شرائط افشا کردیں۔

فرانسیسی اخباروں نے یہ تمام معلومات حاصل کیں۔ ایک صبح چار بجے ایک قاصد نے پیرس ہوسٹل کے دروازے پر دستک دی۔ جہاں امریکی نمائندہ ہربرٹ ہوور ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ شرائط اس کے حوالے کردی گئیں۔ ہوور کی نیند اڑ گئی۔ بعدازاں اس نے بتایا، ''مجھے لگتا تھا کہ ان کے مالیاتی نتائج وعواقب ہی پورے یورپ کو گھٹنوں گرادینے کو کافی تھے۔ اور ریاستہائے متحدہ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اسی دوران ہوور کی ملاقات برطانوی ماہر اقتصاد جان مینارڈ کینز سے ہوئی۔ اسے بھی شرائط کی نقل مل چکی تھی اور وہ بھی اتنا ہی پریشان تھا۔ ہوور نے بعدازاں لکھا، ''یہ شرائط ہم دونوں کو بہت خوف ناک لگیں۔ ہم نے طے کرلیا کہ ان میں مضمر خطرات کی وضاحت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔''

جرمنوں کو ان شرائط پر مبنی معاہدہ پر مجبور کردیا گیا۔ 28 جون 1919ء کو ہونے والے معاہدۂ ورسائی پر دستخط کرنے والے امریکی وفد کے ایک رکن نے لکھا، ''یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ تھا: قدیم دور کے فاتحین اپنے مفتوح کو رتھ کے پہیے تلے کچل دیتے تھے۔''

امن مذاکرات میں شرکت کے سبب ولسن کو کوئی چھ ماہ تک امریکہ سے غیر حاضر رہنا

پڑا۔اس دوران ولسن کی ڈیموکریٹک پارٹی کو رہنمائی میسر نہیں تھی اور اس کے ریپبلکن حریفوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ایوان نمائندگان اور سینیٹ دونوں میں انہیں اکثریت حاصل ہوئی۔ سینیٹ نے اس معاہدۂ امن کی توثیق سے انکار کردیا۔جمعیتِ اقوام میں شرکت کے

* 1870ء سے 1918ء تک فرانسیسیوں کے لیے ایلس لورین ایک تلخ مسئلہ بنا رہا۔ اس سارے دورانیے میں ایلس اور لورین کا نام سے مورتیاں بنا کر پیرس کے ایک چرچ میں رکھی رہیں۔ انہیں 1918 میں فاتحانہ انداز میں ہٹایا گیا۔

خواہاں ولسن نے براہِ راست عوام سے رابطے کا سوچا۔ اس نے آٹھ ہزار میل پر مشتمل ایک دورہ کیا اور چھتیس بڑی تقریریں کیں۔ دورے کے دوران اسے فالج کا حملہ ہوا جو کبھی پوری طرح ٹھیک نہ ہوسکا۔

ولسن کی بیماری نے اس مہم کو متاثر کیا۔ امریکی سینیٹ نے دوسری بار بھی معاہدۂ امن کو مسترد کردیا اور ساتھ ہی ولسن کی جمعیتِ اقوام کو بھی۔ امریکی شرکت کے بغیر یہ ادارہ سخت مشکلات کا شکار ہوگیا۔ اس ادارے کو ثقافتی اور انسانی بنیادوں پر کئی منصوبوں میں کامیابی ہوئی اور اس نے چھوٹی اقوام کے درمیان کئی تنازعات نمٹائے لیکن جلد ہی کھل گیا کہ یہ ادارہ بڑی اقوام کے سلسلے میں مکمل طور پر بے بس ہے۔

جنگ کے بعد کا جرمنی حالتِ انتشار میں تھا۔ اس کی اقتصادیات تباہ ہو چکی تھی۔ اب یہ ملک ایک جمہوریہ تھا جس کا دارالحکومت وائمر (Weimar) کو بنایا گیا تھا۔ لیکن اس کا جمہوری تجربہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ سارے ملک اور بالخصوص بویریا میں جرمن فوج کے سابق افسران نے خفیہ سوسائٹیاں بنا رکھی تھیں۔ وہ ریپبلکن حلومت کو اقتصادی بدحالی کا الزام دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس نے نہایت رُسوا کن معاہدۂ امن پر دستخط کئے ہیں۔ بالخصوص جنگ کی ذمہ داری قبول کرنے والی شق نے جرمنوں کے وقار کو بُری طرح مجروح کیا تھا۔

1920ء میں شاہ پسند اور قوم پرست فوجی افسروں نے جنرل لڈنڈورف کی زیرِ قیادت انقلاب برپا کردیا۔ انہوں نے منتخب عہدیداران کی جگہ ایک شخص ڈاکٹر کیپ (Dr Kapp) کو کٹھ پتلی سربراہِ ریاست بنانے کا اعلان کیا۔ برلن کے کارکنوں نے یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ انہوں نے اشیائے ضرورت کی فراہمی معطّل کردی۔

جب یہ انقلاب ناکام رہا تو لڈنڈورف بویریا چلا گیا اور نیشنلسٹ سوشلسٹ جرمن

MashalBooks.org

ریپبلک پارٹی نامی ایک چھوٹی سی خفیہ تنظیم کے رکن ایڈولف ہٹلر سے ملا۔ اسی سوسائٹی کا ایک مختصر نام نازی پارٹی معروف ہوا۔ لڈنڈورف اور ہٹلر دونوں نے ایک اور انقلاب کے لیے کام شروع کیا۔

1921ء میں زرِتلافی کمیشن نے قرار دیا کہ جرمنی بطور تاوان ایک کھرب پینتیس ارب طلائی مارک بطور تاوان دے گا۔ یورپ کے بہت سے ماہرینِ اقتصادیات کا یقین تھا کہ جرمنی اتنی بڑی رقم ادانہیں کرسکتا۔ یہ رقم وصول کرنے کی فرانسیسی کوششیں ناکام رہیں۔ اس پر فرانس نے اپنے فوجی دستے رہر (Ruhr) کے صنعتی علاقوں میں تعینات کردیئے۔ ویمر حکومت کو تنخواہ دینے کے لیے کرنسی نوٹ چھاپنا پڑے۔ پہلے سے کمزور جرمن کرنسی وقعت کھو بیٹھی۔ 1923ء تک افراطِ زر کا یہ عالم ہوگیا کہ ایک ڈبل روٹی خریدنے کے لیے نوٹ ٹوکری میں لے جانا پڑتے تھے۔ یہ عالم بھی آیا کہ چار ٹریلین کاغذی مارک ایک ڈالر کے برابر قرار پائے۔ اس تباہ کن افراطِ زر کے نتیجے میں متوسط جرمن طبقہ غریب ہوگیا اور پورے یقین سے مان بیٹھا کہ معاشرہ منظم طور پر نہیں چل سکتا۔

1919ء میں جب ہٹلر نازی پارٹی میں شامل ہوا تو اس کے فقط سات رکن تھے۔ 1923ء میں اقتصادی تباہ حالی سے مایوس جرمن اس تنظیم میں یوں داخل ہوئے کہ پارٹی کی رکنیت ستر ہزار سے تجاوز کرگئی۔ 1923ء کے ایک پارٹی اجلاس میں بویری حکومت کے کمشنر نے قرار دیا کہ وائمر حکومت ناکام ہو چکی ہے لیکن ابھی مسلح جدوجہد کے لیے مناسب وقت نہیں آیا۔

اسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے ریوالور سے چھت کی طرف دو گولیاں چلائیں اور چلایا، ''انقلاب آ گیا۔'' اس نے ہال سے باہر جانے کے راستے بند کر دیئے اور باری باری بویریا کے رہنماؤں سے انقلاب کی معاونت طلب کرنے لگا۔

عین موقع پر جنرل لڈنڈورف بھی نمودار ہو گیا۔ اس نے بھی ہٹلر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لگتا تھا کہ بویری رہنماؤں نے ہٹلر اور لڈنڈورف کو قائل کرلیا ہے۔ اُس رات نازی حرکت میں آ گئے۔ پورے شہر میں ریپبلکن اخباروں اور ٹریڈ یونین کے دفاتر برباد کر دیئے گئے۔ یہودیوں کے گھروں پر حملے ہوئے، اور ریلوے سٹیشن اور ڈاک خانے پر قبضہ کرلیا گیا۔ لیکن پولیس نے زبردست مزاحمت کی۔

MashalBooks.org

ہٹلر بھانپ گیا کہ بویریا کے حکومتی افسروں نے جلسے کے دوران مسلح دستوں سے بچ نکلنے کے لیے اس کے انقلاب کا ساتھ دینے کے جھوٹے وعدے کر لیے تھے۔صبح سویرے ہٹلر نے اپنے دستوں سے پریڈ کروائی اور مخالفین کو ہراساں کر دیا۔سواستیکا (پرچم) لہراتے نازی، مارچ کرتے ہوئے، میونخ کے بڑے چوک کی طرف بڑھے۔ یہاں اِن کا تصادم بویری حکومت کے سپاہیوں سے ہو گیا۔گولیوں کی باڑھ چلی اور اٹھارہ نازی مر گئے۔گولیوں سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹنے کی کوشش میں ہٹلر کا کندھا اتر گیا۔صرف جنرل لڈنڈورف اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔جنگ کے آخری سالوں میں جرمن جنگی مشینری میں تقریباً آمر کی حیثیت سے کام کرنے والا یہ بوڑھا جنرل مارچ کرتا حکومتی دستوں کی طرف بڑھا۔ اور اُنہوں نے اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

ہٹلر گرفتار ہوا اور اسے پانچ برس قید بامشقت سنائی گئی۔اُس نے ایک سال سے بھی کم عرصہ جیل میں گزارا اور رہا کر دیا گیا۔ اُس نے قید کا دورانیہ "Mein Kamph" نامی کتاب لکھتے گزارا۔

MashalBooks.org

4

مذہب: مسئلہ کا جزو یا حل

قبائلیت سے عالمگیر بھائی چارے تک

ابتدائی مذاہب مخصوص قبائل کے گرد ہوتے تھے اور اسی لیے ان کی اخلاقیات بھی اپنی اصل میں قبائلی ہوتی تھی۔ بعد ازاں جب نوحجری زرعی انقلاب آیا تو اخلاقیات کے زیادہ عالم گیر ضابطہ کی ضرورت پیش آئی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں شہزادہ گوتم بدھ نے ہندوستان میں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی اور ایک عالمگیر غیر قبائلی ضابطہ اخلاق کا بانی بنا۔ اس کے اقوال میں سے ایک یوں ہے:

''نفرت کو کبھی بھی نفرت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ نفرت کا خاتمہ محبت سے ہوتا ہے۔ غصہ پر محبت سے اور برائی پر اچھائی سے قابو پاؤ۔''

ایک اور قول یوں ہے:

''سزا سے سب انسان کانپتے ہیں۔ سب انسان زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ یاد رکھو تم بھی انہی کی طرح ہو اور کبھی قتل نہ کرو۔''

بدھ مت کے اولین معروف پیروکاروں میں سے ایک اشوک موریا 273 تا 232

MashalBooks.org

قبل مسیح ہندوستان پر حکومت کرتا رہا۔ بدھ مت اختیار کرنے کے بعد اس نے کبھی جنگ کو اپنی حکمت عملی کا حصہ نہ بنایا۔ وہ تاریخ کے پرامن ترین حکمرانوں میں سے ایک بن گیا۔ ایشیا میں بدھ مت کی ترویج میں اس بادشاہ کا بڑا ہاتھ ہے۔

عیسائیت کی بنیاد یہودیت پر قائم ہوئی۔ اس مذہب نے بھی قبائلی وفاداری کی جگہ عالمگیر انسانی بھائی چارے کے لیے کام کیا۔ آج کی تباہ کن ہتھیاروں سے بھری دنیا میں بطور نوع ہماری بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ بطور انسان ہم ایک خاندان کی طرح زندہ رہنے میں کس قدر کوشاں ہیں۔ میتھیو کا قول ہے:

> ''تم نے اب تک سن رکھا ہوگا کہ اپنے ہمسائے سے محبت اور دشمن سے نفرت کرو لیکن میں تمہیں کہتا ہوں اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو۔ انہیں نوازو، جو تمہیں ملامت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ نیکی کرو، جو تمہارے ساتھ نفرت کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا کرو، جو تمہیں اذیت دیتے ہیں۔''

صاف پتہ چلتا ہے کہ اس میں بدھ کی گونج موجود ہے کہ نفرت کا علاج کبھی نفرت سے نہیں ہوتا اور نفرت محبت سے ختم ہوتی ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ بدھ اور یسوع دونوں کی تعلیم قابل عمل نہیں۔ لیکن بغور دیکھیں تو حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یک طرفہ رحم دلی اور تحمل ہی بدلہ اور بدلہ در بدلہ کا چکر ختم کر سکتا ہے جو ہمیں مشرق وسطیٰ اور شمالی آئرلینڈ میں نظر آتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ محبت اور درگزری کی تعلیمات سے وابستگی کے دعوؤں کے باوجود عیسائی اقوام نے تھرمو نیوکلیئر ہتھیار بنا لیے تا کہ ان کے غیظ وغضب کا نشانہ بننے والا بچ نہ پائے۔ ان میں مجرم سیاستدانوں کے ساتھ معصوم بچے بھی شامل ہیں۔ عیسائی قوموں کا عقیدہ کیا ہے اور ان کا عمل کیا ہے، اس میں ایسا ہولناک تضاد موجود ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تضاد نیوکلیئر ہتھیاروں سے پہلے اس وقت بھی موجود تھا جب لیو ٹالسٹائی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں جنوبی افریقہ میں بیٹھے ایک ہندوستانی وکیل سے خط کتابت کر رہا تھا۔

عدم تشدد: ٹالسٹائی، گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ

اچھے ادب کے وظائف میں سے ایک یہ ہے کہ ہم کسی دوسرے انسان کے روپ

MashalBooks.org

میں خود کو دیکھ سکتے ہیں۔ اچھے ادب کو چاہیے کہ انسانی ہمدردی کی حدود کو وسیع کرے اور ہمیں اپنے سے بالکل مختلف لوگوں کے جذبات محسوس کرنے کی اہلیت دے۔

بڑی دلچسپ بات ہے کہ لیو ٹالسٹائی جسے تمام زبانوں کے چند اچھے ناول نگاروں میں رکھا جاتا ہے۔ ان اخلاقیاتی مسائل سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ ٹالسٹائی 1821ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین اوائل عمری میں ہی مر گئے اور وہ کاؤنٹ ٹالسٹائی بنا۔ نوعمری میں وہ بھی ماسکو کے سماجی حلقوں میں خاصا مقبول تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد ازاں اسے اپنی لذت کوشی پر افسوس رہا۔ خود سے غیر مطمئن ٹالسٹائی فوج میں بھی گیا اور فارغ اوقات میں لکھتا رہا۔ اس نے اٹھائیس برس کی عمر میں فوج چھوڑی اور کچھ عرصہ سینٹ پیٹرز برگ میں کام کرتا رہا۔ اسے روسی دہقانوں کی ناخواندگی کا شدید احساس تھا۔ اس نے تعلیمی نظریات اور عملی طریقوں سے شناسائی کے لیے یورپ کے دورے کئے۔ واپسی پر ٹالسٹائی نے دہقانوں کی تعلیم کے ادارے بنائے اور تعلیمی رسالے چھاپتا رہا۔ اس نے کئی درسی کتابیں بھی لکھیں جن میں ہمارے آج کے تعلیمی طریقوں کی جھلک ملتی ہے۔

1862ء میں ٹالسٹائی نے شادی کی تو وہ چونتیس برس کا تھا۔ اس کی بیوی ٹالسٹائی کے علمی مشاغل میں دلچسپی رکھتی تھی۔ * اسی دورانیے میں ٹالسٹائی نے ''جنگ اور امن'' اور ''آنا کرینینا'' جیسے فن پارے بھی تخلیق کئے۔ ''جنگ اور امن'' کے کردار اس کے اپنے اہل خانہ کے نمونے پر بنائے گئے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک بڑی مشہور ہیروئن نتاشا ٹالسٹائی کی سالی کے ماڈل پر تراشی گئی۔ ''جنگ اور امن'' کا پیئر اور ''آنا کرینینا'' کا لیون دونوں اس امر کے غماز ہیں کہ ٹالسٹائی حیات کے معانی سمجھنے کے لیے کیا کچھ کرتا رہا۔ اسے روسی کسان کی حالت زار کا کتنا رنج ہے اور اس حتمی نتیجے کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سچی خوشی اور ذہنی سکون فقط ایک سادہ طرز زندگی اور دوسروں کی خدمت میں پنہاں ہے۔''

اس وقت تک ٹالسٹائی نے ''آنا کرینینا'' ختم کرلیا تھا لیکن وہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن چلا آرہا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس وہ تمام سامان میسر تھا جس کی عام لوگ خواہش کیا کرتے ہیں لیکن اسے اپنا وجود بے معنی لگتا تھا۔ 1879ء میں وہ خودکشی پر بھی غور کرتا رہا۔ اس نے فلسفیوں اور سائنس دانوں کو غور سے اور باقاعدہ پڑھا لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہ پاسکا۔

* تاہم اواخر عمر میں تنازعات نے ٹالسٹائی کی گھریلو زندگی اجیرن کر دی تھی۔

MashalBooks.org

بالآخر ٹالسٹائی کے دل میں دہقانوں کی سادہ اور پُرلگن حیات کی جوت جاگی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ''عہد نامہ جدید'' میں ملنے والی مسیح کی تعلیمات اس کے سوالوں کا جواب ہوسکتی ہیں۔ ٹالسٹائی نے اپنے اس روحانی بحران کا احوال "A Confession" نامی کتاب میں لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے، ''میں نے فراخی قلب کے لیے وہ سارا علم چھان مارا جسے نسل انسانی نے بڑی محنت سے اکٹھا کیا ہے۔ میں نے پورے تن ومن کے ساتھ جان لڑائی اور ایک ڈوبتے شخص کی طرح سہارا تلاش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔''

> ''میں نے سب علوم چھان مارے۔ نہ صرف یہ کہ کچھ نہ ملا بلکہ اس نتیجے پر پہنچا کہ میری طرح جس کسی نے بھی حیات کے معانی علوم میں ڈھونڈے بالآخر ناکام ہوا۔
>
> ''پھر میں نے دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں اور بالخصوص بدھ مت اور اسلام کا مطالعہ بڑی جانفشانی سے کیا۔ لیکن میرا زیادہ تر وقت عیسائیت کے مطالعے میں صرف ہوا اور میں نے اسے صحائف مقدس اور اپنے گرد بسنے والے مسیحیوں میں پایا۔
>
> ''میں سادہ دہقانوں، زیارتوں اور راہبوں کے قریب ہونے لگا۔ خود ہمارے حلقوں میں موجود عیسائیوں کی پوری زندگی ان کے عقائد کے ساتھ متصادم ہے۔ اس کے برعکس دہقانی طبقے کے عیسائی مسیحیت کے اپنے عقائد پر ثابت قدم ہیں۔ میں ان لوگوں کے اعتقادات کو بغور دیکھتا رہا۔ میں نے جتنا گہرا دیکھا میں اور زیادہ قائل ہوا کہ ان کا عقیدہ کتنا حقیقی ہے، ان کے لیے کتنا ناگزیر ہے، انہیں کس طرح زندگی کے معانی دیتا ہے اور ان کے لیے زندگی بسر کرنا ممکن بناتا ہے۔ یوں رفتہ رفتہ میں ان لوگوں میں گھل مل گیا اور ان کے ساتھ محبت کرنے لگا۔''

اس نے ماسکو کی غریب آبادیوں کا مشاہدہ کیا اور اسے پتہ چلا کہ شہر کا غریب باسی کتنی ابتلا میں ہے وہ لکھتا ہے:

> ''ہمارے درمیان، یعنی غریبوں اور امیروں کے درمیان، ایک باطل تعلیم کی دیوار کھڑی ہے۔ اگر ہمیں ان غریبوں کی مدد کرنا ہے تو پہلے

MashalBooks.org

اس دیوار کو گرانا ضروری ہے۔ غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ طبقۂ غرباء کی حالت زار کی حقیقی وجہ ہماری اپنی دولت ہے۔

اس نے غربت کی وجوہات کا تجزیہ کیا اور اسے اپنی کتاب "What Then Must We Do" میں بیان کیا۔ اسے احساس تھا کہ زاروں کا قائم کردہ سیاسی نظام تشدد پر مبنی ہے اور اس کا مسیح کی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ کہ ریاست مذہب کو بطور پردہ استعمال کر رہی ہے۔ وہ بھانپ گیا کہ غربا اور امرا کے درمیان اس فرق کو برقرار رکھنے کے لیے تشدد کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات بھی تشدد کے استعمال پر مبنی ہیں۔ اسے احساس تھا کہ عیسائیت اور جنگ میں کتنا بُعد پایا جاتا ہے۔ اپنی ایک چھوٹی سی کتاب "The Kingdom of God Is Within Us" میں وہ لکھتا ہے:

''بین الاقوامی تعلقات میں جو تضادات پائے جاتے ہیں ان کے سامنے دوسرے تضادات کچھ بھی نہیں۔ انہیں دور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان پر ہی تہذیب کی بقا کا انحصار ہے۔ یہ مسیحی روح اور جنگ کے درمیان تضاد ہے۔

''دنیا بھر میں بسنے والے عیسائی ایک سی روحانی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی لیے جہاں بھی کوئی اچھا کام ہوتا ہے یا ثمر بار سوچ سامنے آتی ہے اسے فوراً عیسائیوں میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ اور سب عیسائی بلاامتیاز قوم اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہم سب انسان جو دیگر ممالک کے مفکروں اور شاعروں کو بھی چاہتے ہیں۔ ہم سب انسان ان کی کامیابیوں کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ ان سے ملنے میں مسرت پاتے ہیں اور ان کا استقبال خوش دلی سے کرتے ہیں۔ لیکن ہم سب لوگوں کو ریاست مجبور کر دیتی ہے کہ انہی لوگوں کے ساتھ خونریز لڑائی کریں۔ لڑائی اگر آج نہیں تو کل ضرور چھڑ جائے گی۔ حکومت عیسائیت کی بھائی چارے کی تعلیم کا اقرار کرتی ہے۔ لیکن اس کا عمل اس عقیدے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ ریاستی فوجی قوانین ہر شہری سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ قتل و غارت کی تربیت حاصل کرے اور

MashalBooks.org

بیک وقت ایک عیسائی اور گلیڈ یئیٹر کا کردار ادا کرے۔''

عیسائیت اور سماجی سوالوں پر ٹالسٹائی کی تحریریں سرکاری سنسر کی نذر ہوئیں اور اسے روسی آرتھوڈوکس چرچ والوں نے اپنے عقیدے سے خارج کر دیا۔ اس کے باوجود بطور مصنف اس کا رتبہ عالمی سطح پر مسلمہ رہا اور اسے روس کے اندر اور باہر بہت سے پیروکار میسر آئے۔

1894ء میں ہندوستان کے ایک نوجوان وکیل موہن داس کرم چند گاندھی نے عیسائیت پر ٹالسٹائی کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان سے متاثر ہوا۔ گاندھی نے اس کی کتاب **"The Kingdom of God is Within Us"** پر تبصرہ لکھ کر ٹالسٹائی کو بھیجا۔ علاوہ ازیں اس نے جنوبی افریقہ میں شہری حقوق کی تحریک کا حال بھی ٹالسٹائی کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ٹالسٹائی نے اسے لکھا:

> ''میری عمر جوں جوں بڑھی اور خاص طور پر اب جبکہ میں مرنے کے قریب ہوں میری دوسروں کو بتانے کی یہ خواہش بڑھتی گئی اور میں اس کی اہمیت کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگا کہ عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنی اصل میں یہ محبت کا پرچار ہے جس میں جھوٹی تعبیروں کی ملاوٹ نہیں۔ یہی محبت ہے جو انسانی روحوں کا وصل کرواتی ہے۔ اور یہی انسانی زندگی کا بلند ترین اور واحد قانون ہے۔ ہر انسان کی روح اپنی گہرائیوں میں اسے پہچانتی ہے۔ اس کی واضح ترین مثال ہمیں بچے میں نظر آتی ہے۔ جب تک وہ دنیا کی جھوٹی تعلیمات میں ملوث نہیں ہوتا اسے پہچانتا ہے۔ ہندوستان ہو یا چین، یہودی ہوں یا رومی، یا یونانی ہر جگہ کے دانشوروں نے اسے پہچانا ہے اور بیان کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ قانون یسوع نے واضح ترین انداز میں بیان کیا اور واضح کر دیا کہ اسی میں سب قانون اور پیغمبر ہیں۔
>
> ''مسیحی دنیا کے رہنے والے اس بات کو مانتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تشدد کو روا رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اس کے گرد استوار کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کی زندگی ان کے قول اور ان کی حیات کے اصولوں کے مابین ایک تضاد بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ تضاد اس محبت اور اس تشدد کے درمیان ہے جسے وہ زندگی کا قانون مانتے ہیں اور جس پر وہ اپنے عمل کو استوار کرتے ہیں۔ وہ اس تشدد کو زندگی کے مختلف مراحل میں مثلاً حکمرانوں کی قوت، درباروں اور فوجوں کے لیے روا رکھتے ہیں۔''

''اس سال بہار میں ماسکو میں لڑکیوں کے ایک ہائی سکول میں آسمانی صحائف کے امتحان میں استاد اور بشپ نے لڑکیوں سے احکام خداوندی اور بالخصوص چھٹے حکم پر سوال کئے۔ درست جواب پانے کے بعد بشپ نے ایک عام سا سوال کر دیا کہ آیا خدائی قانون میں قتل ہر صورت میں منع ہے۔ نوعمر لڑکیوں نے اپنی سابقہ تعلیم کی روشنی میں جواب دیا کہ قتل ہمیشہ منع نہیں بلکہ جنگ اور مجرموں کو سزا دیتے وقت جائز ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے ایک لڑکی نے قدرے سراسیمہ ہو کر فیصلہ کن جواب دیا کہ 'ہاں قتل ہر صورت میں منع ہے اور ''عہد نامہ قدیم'' میں اسے کسی صورت میں روا نہیں رکھا گیا۔ یسوع نے نہ صرف قتل منع کیا ہے بلکہ ایک بھائی کے خلاف ہر طرح کی برائی سے بھی روکا ہے۔ اپنے تمام تر شکوہ اور فن خطابت کے باوجود بشپ خاموش ہو گیا اور لڑکی فاتح رہی۔''

ٹالسٹائی کا ایقان تھا کہ کوئی بھی صورتحال تشدد کا جواز نہیں بنتی۔ اسی لیے حکومتی تشدد کے خلاف فرد کی جدوجہد کو ہر صورت میں غیر متشددانہ ہونا چاہیے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہر کسی کو اپنی ضروریات کم از کم رکھنا چاہئیں تا کہ اسے کسی مزدور کا استحصال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ٹالسٹائی نے گوشت، شراب اور تمباکو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے کمرے کی صفائی خود کرتا، سادہ دہقانی لباس پہنتا، کھیتوں میں کام کرتا اور اپنے جوتے خود مرمت کرتا۔ اس نے قحط زدگان کی مدد میں حصہ لیا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اپنی ساری دولت غربا میں بانٹ دے لیکن اہل خانہ کے

MashalBooks.org

احتجاج پر وہ ان کے حق میں اپنی دولت سے دستبردار ہو گیا۔

اپنے اہل خانہ کو قائل کرنے میں ناکامی کے بعد ٹالسٹائی نے 1910ء میں نومبر کی ایک رات کو گھر چھوڑا اور اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو لے کر کنگ لیئر کی طرح نکل گیا۔ چند دن کے بعد وہ دور دراز واقع ایک ریلوے جنکشن پر نمونیے سے مرا پایا گیا۔

گاندھی نے عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کو عملی سیاسی قوت کی شکل دی۔ وہ 1869ء میں پور بندر، انڈیا، میں پیدا ہوا۔ اس کے اہل خانہ کا تعلق ہندو دکانداروں کی ایک ذات سے تھا۔ گاندھی کا مطلب کریانہ فروش ہے۔ تاہم ترقی کے زینے چڑھتے گاندھی کا باپ، دادا اور چچا مغربی ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے رجواڑوں میں وزارت عظمیٰ پر فائز رہے۔

1888ء میں گاندھی بحری جہاز پر انگلینڈ پہنچا اور لندن کے انر ٹیمپل میں تین سال قانون پڑھتا رہا۔ انگلینڈ روانگی سے پہلے اس کی ماں نے عہد لیا تھا کہ وہ شراب، شباب اور گوشت سے پرہیز کرے گا۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران اس کا تعارف بھگوت گیتا کے مترجم سر ایڈورڈ آرنلڈ، مذہبی فلسفی میڈم بلاوٹسکی، اینی بیسنٹ اور فیبی انز سے ہوا۔ یہ سب لوگ عینیت پسند اور سماجی نقاد تھے۔ ان کی صحبت میں گاندھی اپنے شرمیلے پن سے آزاد ہوا اور اسے سماجی فلاح کے کاموں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ گاندھی کا کردار غیر معمولی طور پر ایماندارانہ تھا۔ اس لیے اسے نسلی تعصب کا سامنا نہ کرنا پڑا اور وہ بہت سارے دوست بنانے میں کامیاب رہا۔ تاہم چند سال بعد جب وہ پریٹوریا، جنوبی افریقہ، پہنچا تو اسے بدترین نسل پرستی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار جب بہترین تراش کے انگریزی لباس اور درجہ اول کے ٹکٹ کے باوجود اسے کہا گیا کہ وہ درجہ سوم میں سفر کرے یا ٹرین سے اتر جائے تو اس نے ٹرین سے اترنے کو ترجیح دی۔ ایک اور موقعہ پر جب اس نے سیٹ پر بیٹھنے کے اپنے حق پر اصرار کیا تو اسے پیٹ ڈالا گیا۔ گاندھی اصل میں ایک عدالتی مقدمے کے سلسلے میں جنوبی افریقہ پہنچا تھا۔ یہ مقدمہ دو ہندوستانی تاجروں دادا عبداللہ اور سیٹھ طیب کے درمیان تھا اور اس میں چالیس ہزار پاؤنڈ کے لین دین کا جھگڑا تھا جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ گاندھی نے انہیں اپنا مقدمہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے عدالت سے باہر نمٹانے پر راضی کر لیا۔ بعد ازاں گاندھی نے اپنی کتاب میں لکھا:

''دونوں اس انجام پر خوش تھے اور لوگوں میں دونوں کی توقیر بڑھی۔

مجھے بے حساب خوشی ہوئی۔ مجھے موقعہ ملا کہ انسانی فطرت کا بہتر رخ دیکھوں اور دلوں تک رسائی پاؤں۔ مجھے لگا کہ ایک وکیل کا حقیقی کردار فریقین کو پھر سے یکجا کرنا ہے۔ یہ سبق ایسا انمٹ ثابت ہوا کہ میں اپنی وکالت کے اگلے بیس سال تک اسی طریق پر کاربند رہا اور میں نے ہزاروں مقدمات میں فریقوں کے درمیان مفاہمت کروائی۔ میرا کچھ نہیں گیا حتیٰ کہ رقم بھی نہیں اور میری روح تو یقیناً محفوظ رہی۔''

گاندھی ہندوستان لوٹنے کو تھا کہ اپنے اعزاز میں عبداللہ سیٹھ کی طرف سے دی گئی ایک پارٹی میں اسے پتہ چلا کہ جنوبی افریقہ میں موجود ہندوستانیوں کو ووٹ سے محروم رکھنے کے لیے قانون سازی ہو رہی ہے۔ گاندھی نے وہیں رکنے اور قانون کے خلاف مزاحمت کا فیصلہ کر لیا نے اگلے بیس سال جنوبی افریقہ میں گزارے اور ہندوستانی کمیونٹی کی رہنمائی کرتا رہا۔

انگلینڈ میں قیام کے دوران گاندھی نے انگریز روشن خیالی اور منصفانہ قانون پر ایمان کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر برطانوی سلطنت کے کسی حصے میں ہونے والی ناانصافی کی خبر یہاں کے لوگوں کو دے دی جائے تو اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے عدم تشدد پر مبنی مظاہرے منظم کئے جن میں احتجاج کرنے والے اپنی قربانی دے کر نہایت منظم اور مثبت طریقے سے قانون میں موجود ناانصافی کو ثابت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جب حکومت نے قرار دیا کہ ہندو، مسلم اور پارسی شادیوں کی کوئی قانونی وقعت نہیں تو گاندھی اور اس کے ساتھی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہے اور جیل گئے۔

گاندھی نے احتجاج کی اس شکل کو واضح کرنے کے لیے دو لفظ برتے ''ستیہ گرہ'' یعنی ''سچ پر اصرار'' اور ''اہنسا'' یعنی ''عدم تشدد۔'' ان میں سے اہنسا کی وضاحت کرتے ہوئے گاندھی نے لکھا، ''میں دنیا کو کوئی نئی تعلیم نہیں دیتا۔ سچ اور عدم تشدد اتنے ہی قدیم ہیں جتنا کہ خود انسان۔ میں نے فقط اتنا کیا ہے کہ جس قدر بڑے پیمانے پر ہو سکے اس کا اطلاق کیا جائے۔ اس عمل میں مجھ سے غلطی ہوئی اور میں نے اس سے سبق بھی سیکھے۔ چنانچہ میرے لیے زندگی اور اس کے مسائل صداقت اور عدم تشدد میں ہونے والے تجربات ہیں۔'' گاندھی

MashalBooks.org

نے اپنی خودنوشت سوانح میں لکھا:

''مجھے تین مفکرین نے متاثر کیا اور میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے: ہندوستانی فلسفی اور شاعر رائے چند بھائی نے اپنے تعلق خاطر سے، ٹالسٹائی نے اپنی کتاب "The Kingdom of God is Within Us" سے اور رسکن نے اپنی کتاب "Un to This Last" سے۔''

گاندھی نے رسکن کی کتاب 1904ء میں پڑھی۔ یہ کتاب جدید صنعتی معاشرت کا تلخ تنقیدی جائزہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ دوستی اور گرمجوشی کے شخصی تعلقات بھی دولت کی ایک قسم ہیں جنہیں ماہرین اقتصادیات شناخت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے تعلقات چھوٹی زرعی کمیونیٹوں میں آسانی کے ساتھ بن جاتے ہیں اسی لیے مرکزیت اور صنعت کاری انسانی سرخوشی میں کمی کردے گی۔ جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران گاندھی نے ٹالسٹائی اور رسکن کے خیالات پر مبنی دو مذہبی یوٹو پیائی کمیونٹیاں دی تھی۔ 1904ء میں فینکس فارم اور 1910ء میں ٹالسٹائی فارم قائم کیا گیا۔ یہی زمانہ تھا جب اس نے برہم چاری ہونے کا حلف اٹھایا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی کی صحت خراب تھی اور وہ اسے مزید پیدائش کی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شہری حقوق کی جدوجہد کو پورا وقت دینا چاہتا تھا۔

جنوبی افریقہ میں شہری حقوق کی قیادت کے دوران گاندھی کی شہرت پھیلی تو اسے قائل کر لیا گیا کہ ہندوستان واپس آ کر ہوم رول کی قیادت سنبھالے۔ وہ 1914ء میں ہندوستان واپس آیا۔ ہندوستان کے حالات سے شناسائی کے لیے اس نے انتھک سفر کیے اور اس نے درجہ سوم میں سفر کو اپنا اصول بنالیا۔

گاندھی کے اگلے چند سال کانگرس کو ازسرنو منظم کرتے گزرے۔ تاکہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی جماعت بن کر نہ رہ جائے۔ گاندھی چاہتا تھا کہ اس میں غربت، بیماری اور غلامی کے ناقابل برداشت بوجھ تلے دبے کسان بھی شامل ہوں۔ غریب ہندوستان کی نمائندگی کی علامت کے طور پر گاندھی نے کھدر کے لنگوٹ کو اپنا لباس بنایا۔ اس نے دور دراز کے دیہات میں جا کر عدم تشدد کا درس دیا اور کانگرس کو نئے کارکن مہیا کیے۔

MashalBooks.org

اسی زمانے میں گاندھی کو مہاتما یعنی ''عظیم روح'' کہا جانے لگا۔

گاندھی برطانوی عوام کو دکھانا چاہتا تھا کہ اگرچہ برطانوی راج ہندوستانیوں کے لیے کئی طرح سے مفید ثابت ہوا لیکن انہیں اپنی عزت نفس اور خود انحصاری کی صورت میں بھاری قیمت دینا پڑی ہے۔ گاندھی نے اس امر کو واضح کرنے کے لیے بے شمار مظاہرے منظم کئے۔ مثال کے طور پر 1930ء میں اس نے نمک کے قوانین کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ ان قوانین کے تحت نوآبادکار برطانوی حکومت کو نمک پر اجارہ داری ملتی تھی۔ اور سمندری پانی کی تبخیر سے نمک سازی کے مقامی کاروبار پر پابندی لگتی تھی۔ ہندوستانیوں کی اکثریت غریب کسانوں پر مشتمل تھی۔ جنہیں شدید دھوپ میں گھنٹوں کام کرنا پڑتا تھا اور ان کے لیے نمک اتنا ہی ضروری تھا جتنی کہ روٹی۔ نمک پر لگنے والا ٹیکس دراصل کاشتکاروں کے پسینے پر ٹیکس تھا۔

مہم شروع کرنے سے پہلے گاندھی نے وائسرائے لارڈ ارون کے نام اپنے نہایت شائستہ خط میں وضاحت کی کہ ان کے قوانین کس طرح غیر منصفانہ ہیں۔ اس نے عندیہ بھی دیا کہ ان قوانین کے خاتمے تک ان کے خلاف تحریک جاری رہے گی۔ 12 مارچ 1930ء کو اپنے بہت سے پیروکاروں اور پریس کے نمائندوں کو ساتھ لے کر گاندھی دن کو فاصلہ طے کرتا۔ راتوں کو پڑاؤ ہوتا اور عبادتی اجتماع منعقد کئے جاتے۔ اس جلوس پر دیہاتیوں نے پھول برسائے۔

15 اپریل کو جلوس ساحل پر پہنچ گیا۔ یہ رات انہوں نے ساحل پر عبادت میں گزاری۔ صبح ہونے پر لوگ سمندری پانی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے برتنوں میں پانی لیا اور دھوپ میں ان کی تبخیر کرنے لگے۔ اگرچہ نمک تو کیا بننا تھا لیکن گاندھی کے اس عمل کو ایک طاقت ور حیثیت ملی۔ پورے ہندوستان میں سول نافرمانی کے مظاہرے ہونے لگے۔ یہ تحریک اتنی بڑی تھی کہ امپریل حکومت کو مجبوراً لوگوں کی ہر ممکن زیادہ تعداد کو گرفتار کرنے کی حکمت عملی اختیار کرنا پڑی۔ گرما کے وسط تک گاندھی اور اس کے ایک لاکھ پیروکار گرفتار ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود یہ تحریک جاری رہی۔

جنوری 1931ء میں گاندھی کو رہا کر دیا گیا اور لارڈ ارون نے اسے مذاکرات کی دعوت دی۔ طے پایا کہ گاندھی مظاہرے ختم کرنے کا اعلان کرے گا اور لندن میں منعقدہ

ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں انڈین ہوم رول پر ہونے والی بات چیت میں حصہ لے گا۔ لارڈ ارون نے تمام قیدی رہا کرنے کا اعلان کیا اور نمک کے قوانین میں اس طرح تبدیلی کی کہ ساحل کے نزدیک رہنے والے لوگوں کو اپنا نمک خود بنانے کی اجازت مل گئی۔

''نمک مارچ'' گاندھی کے عدم تشدد کے طریقوں کی ایک مثال تھی۔ مظاہروں کے دوران اس نے اپنے مخالفین کے ساتھ دوستانہ رویہ روا رکھا اور تنازعہ کو ہوا دینے سے گریز کیا۔ چنانچہ جب مظاہرے ختم ہوئے تو مفاہمت تک پہنچنے کی فضا موجود تھی۔ گاندھی جب بھی قید ہوا اس نے جیل والوں کو اپنا میزبان سمجھا۔ ایک بار سینڈلوں کا جوڑا بنا کر جنوبی افریقہ کی حکومت کے سربراہ جنرل سمٹس (Smuts) کو بھیجا۔ گاندھی نے عیسائیت کے اس اصول پر عمل کیا: ''اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور ان سے نیکی کرو جو تم سے نفرت کرتے ہیں۔''

گاندھی کی اہمیت اس امر میں ہے کہ وہ ایک ایسا بڑا سیاسی لیڈر تھا جس نے سیاست میں مذہب کے اخلاقیاتی اصول متعارف کروائے۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتا ہے، ''میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اور بڑی عاجزی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو سمجھتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں وہ مذہب کے معانی نہیں جانتے۔''

گاندھی کا ایمان تھا کہ انسان کی سرشت میں خیر شامل ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ دوسروں کے کردار میں شامل اچھائی کو تلاش کریں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ وکالت کے زمانے میں بھی گاندھی کا مقصد جدا ہونے والے فریقین کو متحد کرنا رہا۔ اس نے سیاست میں بھی اس مقصد کو پیش نظر رکھا۔ سیاست میں مفاہمت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تنازعات کو ہوا نہ دی جائے۔ اسی لیے گاندھی نے فقط صداقت کی قوت پر تکیہ کیا اور عدم تشدد کے طریقے اپنائے۔ اس کا کہنا تھا، ''میرا ایقان ہے کہ تشدد کی بنیاد پر کچھ تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔''

گاندھی کو اس عام اصول سے اختلاف تھا کہ نیک مقصد کے لیے کسی بھی طرح کے طریقے برتے جاسکتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اصل چیز طریقہ ہے اور اتنا ہی اہم ہے جتنا مقصد۔ اس کا کہنا تھا، ''خدا نے ہمیں طریقوں پر (بہت محدود) اختیار دیا ہے۔ اور نتیجہ پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ طریقوں کو بیج سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور نتیجہ کو درخت سے۔ طریقوں اور نتائج یا حاصل کے مابین وہی تعلق ہے جو بیج اور درخت کے درمیان ہوتا ہے۔ میرے

MashalBooks.org

فلسفۂ حیات میں ذرائع اور حاصل باہم قابل مبادلہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں غلط طریقہ کا نتیجہ لازماً غلط ہوگا۔ ہلاکت فقط مزید ہلاکت کو جنم دے سکتی ہے اور نفرت فقط مزید نفرت کو۔

جس طرح منفی کا نتیجہ منفی کی صورت نکلتا ہے۔ اسی طرح مثبت کا نتیجہ مثبت کی صورت نکلنا چاہیے۔ اچھے عمل پر اچھا ردعمل ہوگا۔ فراخ دلی کا اظہار فراخ دلانہ ردعمل پیدا کرے گا۔ بندہ پروری کی صورت میں بندہ پروری منعکس ہوگی۔ ہندو اور بدھ اس قانون کو کرم کا قانون کہتے ہیں۔

گاندھی کا ایقان تھا کہ پرتشدد ذرائع کے نتیجے میں حاصل کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ چونکہ گاندھی کے طریقے محبت، افہام وتفہیم اور سمجھوتے پر مبنی تھے چنانچہ عدم تشدد پر مبنی اس کی تحریک کے مابعد نتائج میں معاونت شامل نہ تھی۔ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت ختم ہوگئی۔ دونوں ممالک عملاً جدا ہو گئے۔ لیکن ان کے مابین کچھ بہت زیادہ تلخی پیدا نہ ہوئی۔ ہندوستان نے انگریز کے بعض اچھے خیالات کو اپنا لیا جن میں سے ایک پارلیمانی جمہوریت تھی اور بعد میں یہ ممالک ثقافتی واقتصادی روابط میں بندھے رہے۔

عدم تشدد پر مبنی ایک اور کامیاب تحریک مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی قیادت میں امریکی کالوں نے چلائی۔ جنوبی ریاستوں کے ایک بپٹسٹ منسٹر کنگ کو 1955ء میں بوسٹن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ملی۔ مطالعہ کے دوران اسے تھوریو کے ایک مضمون "On The Duty of Civil Disobedience" نے متاثر کیا۔ اس نے مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے بھی اثر قبول کیا۔

کنگ نے امریکی شہر منٹگمری کی بسوں میں نسلی امتیاز کے اصولوں کے خلاف ہونے والی تحریک کی قیادت سنبھالی۔ اگرچہ صورتحال نہایت تناؤ کا شکار تھی لیکن اس نے دشمنوں کے ساتھ محبت اور عدم تشدد کے متعلق گاندھی کے طریقے ذہن میں رکھے۔ منٹگمری امپروومنٹ ایسوسی ایشن کے سامنے اپنی پہلی تقریر میں کنگ نے کہا:

> ''ہمارا طریقہ ترغیب کا ہوگا جبر کا نہیں۔ ہمیں لوگوں سے فقط اتنا کہنا ہے کہ اپنے ضمیر کی آواز پر چلو۔ ہمارے عمل مسیحی عقیدے کے عمیق ترین اصولوں کے عین مطابق ہوں گے۔ محبت ہمارے خیالات کو منضبط رکھے گی۔ ہمیں صدیوں پہلے کہے گئے یسوع کے الفاظ کی باز

گشت پر کان دھرنا ہوں گے۔

''اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ انہیں دعا دو۔ جو تمہیں لعنت ملامت کرتے ہیں، اور تمہارے ساتھ حقارت کا سلوک کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو ہمارا احتجاج تاریخ کے سٹیج پر ایک بے معنی ڈراما بن کر ختم ہو جائے گا اور اس کی یاد شرم کے گندے چیتھڑوں میں ملبوس ہمارے سامنے آئے گی۔ اپنے ساتھ ہونے والی تمام تر بدسلوکی کے باوجود ہمیں تلخ کام نہیں ہونا اور نہ ہی اپنے سفید فام بھائیوں سے نفرت کرنا ہے۔ بکرٹی واشنگٹن نے ایک بار کہا تھا، 'کسی بھی شخص کے سلوک سے اتنا نہ گر جاؤ کہ اس سے نفرت کرنے لگو۔'

''اگر آپ اپنے احتجاج میں حوصلے سے کام لیتے ہیں، وقار اور مسیحی محبت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تو اگلی نسلوں کے مورخ کو رک کر یہ کہنا پڑے گا، 'یہ عظیم لوگ ہیں۔ کالے لوگ جنہوں نے تہذیب کی رگوں میں نئے معانی اور وقار اتارا۔' ہم سب کو چیلنج درپیش ہے اور ہم سب پر عائد ہونے والی ذمہ داری۔''

دسمبر 1955ء میں ڈاکٹر کنگ کی اس تقریر نے کالوں کی شہری حقوق کی تحریک کا مزاج متعین کر دیا۔ اگرچہ نسل پرستی کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کو تشدد اور ظلم کا سامنا کرنا پڑا اور ڈاکٹر کنگ سمیت بہت سے لوگوں کو غیر منصفانہ طور پر قید رکھا گیا، ان کے رہنماؤں کے گھروں پر بم برسائے گئے، انہیں قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں اور بہت سوں کو واقعی قتل کر دیا گیا لیکن انہوں نے نسلی امتیاز کے خلاف اپنے احتجاج کو ہمیشہ پر امن رکھا۔ مسیحی اخلاقیات سے اس وابستگی کا نتیجہ تھا کہ بالآخر عام لوگ اس تحریک کی حمایت کرنے لگے اور ریاستہائے متحدہ کی سپریم کورٹ نے نسلی امتیاز کو غیر آئینی قرار دے دیا۔

1959ء میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے وزیراعظم جواہر لعل نہرو کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہاں انہیں گاندھی کے قائم کردہ آشرم دیکھنے کا موقع ملا اور اس نے گاندھی کے بہت سے پیروکاروں کے ساتھ عدم تشدد پر بات چیت کی۔

1964ء میں کالوں کے حقوق کی عدم تشدد پر مبنی تحریک نے عوامی رائے کو اتنا

متاثر کیا کہ شہری حقوق کا ایکٹ منظور کر لیا گیا۔ اس سال کنگ کو امن کا نوبیل انعام دیا گیا۔ ڈاکٹر کنگ نے قرار دیا کہ وہ یہ انعام انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ تحریک کے کارکن کی حیثیت سے وصول کرے گا۔ اس نے انعام کی رقم فوراً تحریک کو عطیہ میں دے دی۔

1967ء میں ڈاکٹر کنگ کو قتل کر دیا گیا۔ قتل سے کچھ دیر پہلے اس نے نیویارک سٹی میں نکلنے والے ایک بہت بڑے جلوس میں جنگ ویت نام کی مذمت کی تھی۔ وہ قرار دیتا تھا کہ عدم تشدد کا موید ہونے کے ناتے جنگ کی مخالفت ازخود اس کا فرض بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر کنگ نے اپنی کتاب "Strength to Love" میں لکھا: ''تجربے سے حاصل ہونے والی عقل سے سبق ملتا ہے کہ جنگ فرسودہ شے ہے۔'' ممکن ہے کہ کبھی ایسے زمانے موجود رہے ہوں جب برائی کی قوت کو پھیلنے سے روک کر جنگ نے منفی اچھائی کا کردار ادا کیا ہو لیکن جدید ہتھیاروں کی قوت نے اس امکان کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ حیات گزارے جانے کے قابل ہے اور انسان کو بقاء کا حق حاصل ہے تو پھر ہمیں جنگ کا متبادل تلاش کرنا ہوگا۔ میرا ایمان ہے کہ جب انسانیت کو نیوکلیائی موت کا سامنا ہو تو مذہب کو خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ اگر مذہب اپنے مشن میں صادق ہے تو اسے نیوکلیائی ہتھیاروں کی دوڑ کو ختم کرنے کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔

اپنے دشمنوں سے محبت کرنے کے مسیحی اصول کے حوالے سے ڈاکٹر کنگ نے کہا:

> ''ہمیں اپنے دشمنوں سے محبت کیوں کرنی چاہیے؟ اس لیے کہ نفرت کے بدلے نفرت دینے سے نفرت بڑھتی ہے۔ یہ ستاروں سے محروم رات کی تاریکی میں اضافہ کرنے والی بات ہے۔ تاریکی کا مداوا تاریکی سے نہیں ہوسکتا۔ یہ کام صرف روشنی کر سکتی ہے۔ فقط محبت ہی وہ قوت ہے جو دشمن کو دوست بنا سکتی ہے۔ نفرت کا جواب نفرت سے دیا جائے تو دشمن سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ دشمن سے چھٹکارے کے لیے دشمنی سے چھٹکارا ضروری ہے۔ اسی رویے کے سبب لنکن خانہ جنگی کے دوران جنوب کے حق میں مہربانی کے لفظ استعمال کر پایا۔ پاس کھڑی ایک عورت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر کر سکتا ہے تو لنکن نے جواباً کہا، 'انہیں دوست بنا کر بھی تو میں

اپنے دشمنوں کو تباہ کر سکتا ہوں۔''

پچاس اور ساٹھ کے عشروں کی شہری حقوق کی تحریک بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اگر اس تحریک نے تشدد کے طریقے اپنائے ہوتے تو اس کا نتیجہ نسلی نفرت کی صورت نکلتا۔ لیکن کنگ نے یسوع کا اپنے دشمن سے محبت کا اصول اپنا کر تحریک کی اخلاقیاتی سطح بلند کر دی۔ حتمی نتیجے کے طور پر سیاہ اور سفید فام کمیونیٹوں کے مابین مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ بعد ازاں گاندھی اور کنگ کے عدم تشدد کے طریقے جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف ہونے والی جدوجہد میں بڑی کامیابی سے استعمال کئے گئے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے شہری حقوق کی تحریک، ہندوستان کی تحریک آزادی اور ریاستہائے متحدہ میں کالوں کی شہری حقوق کی تحریک میں عدم تشدد کی کامیابی سے پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کا یہ طریقہ بعض اوقات حکومتی تشدد کی مزاحمت اور غیر منصفانہ قوانین بدلوانے میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔ خود ایک بار گاندھی نے کہا تھا کہ حاصل ہونے والے نتائج میں ذرائع اور طریقے لازماً جھلکتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی سیاسی تحریک کا نتیجہ افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کی صورت میں لینا ہے تو عدم تشدد کے طریقے ناگزیر ہیں۔

تاہم ایک اور سوال بھی جواب کا منتظر ہے کہ کسی معاشرے سے تشدد کس حد تک مکمل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے اور اس پر محبت کی حکمرانی ہو سکتی ہے۔ تشدد کی مذمت میں ٹالسٹائی کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھا اور کہتا تھا کہ تشدد کسی بھی حالت میں جائز نہیں۔ حتیٰ کہ قانون کے نفاذ کے لیے بھی نہیں۔ ٹالسٹائی کے دلائل منطقی اعتبار سے مکمل ہیں۔ اور خطبۂ سرکوہ کی رو سے بھی مطابقت میں ہیں۔ تاہم بعض اوقات لگتا ہے کہ وہ وضاحت کی غرض سے مبالغہ بھی کر سکتا ہے۔

ٹالسٹائی کا کہنا تھا کہ زمین پر خدا کی بادشاہت کا استقرار صرف اس امر کا متقاضی ہے کہ مرد و زن سب تشدد کو چھوڑ کر محبت کا قاعدہ اپنا لیں۔ بلاشبہ وہ درست کہتا ہے لیکن لفظ ''تمام'' قدرے کھٹکتا ہے۔ اگر تمام انسان محبت کی راہ اپنا لیں تو تشدد واقعی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم میں سے کچھ بھیڑ کے بچے اور کچھ ظالم بھیڑیئے ہی رہیں تو کیا ہوگا؟ بھیڑیئے تو میمنوں کو پھاڑ کھائیں گے۔ یہی وہ مشکل ہے جس نے عدم تشدد پر مبنی معاشرت کی راہ روکے رکھی ہے۔ ہتھیاروں کی دوڑ میں اصل مسئلہ یہی ہے۔ یہی وہ معمہ ہے جسے ہمیں کسی نہ

کسی طور حل کرنا ہے۔ تاکہ تہذیب کو تیسری عالمی جنگ سے بچا رکھیں۔

اگرچہ کوئی حقیقی معاشرہ تشدد سے پوری طرح پاک نہیں لیکن بعض معاشرے کم متشدد ہیں۔ مثال کے طور پر جاگیردارانہ جاپان نہایت متشدد معاشرہ تھا۔ اور کبھی امریکی مغرب میں بھی ہر کسی کے پاس بندوق تھی۔ داستانوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو سکینڈے نیویا بھی انتہائی متشدد ہوا کرتا تھا۔ اس کے برعکس ایسے معاشرے بھی موجود ہیں جہاں عدم تشدد کی سطح بہت اونچی ہے۔ مثلاً بھوٹان، تبت اور آج کے سکینڈے نیویا اور سوئٹزرلینڈ۔

پچھلے چند سو سال کے دوران دنیا میں بہت سی اقوام نے داخلی تشدد میں قابل ذکر حد تک کمی کی ہے۔ چند صدیاں پہلے فرانس یا انگلینڈ میں بھی شرفا تلوار لگا کر نکلتے تھے اور رومال چرانے پر بچوں کو پھانسی ہو جاتی تھی۔ آج وہاں عام حالات میں شہریوں کو ہتھیار لگا کر نکلنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور کئی ملکوں میں تشدد اور سزائے موت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دوسری طرف بین الاقوامی تشدد کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے۔

بیسویں صدی کے دوران ہونے والی بڑی جنگوں نے بے نظیر تباہی پھیلائی اور انسانیت کو تیسری عالمی جنگ کا اندیشہ بھی لاحق ہے جس کے سامنے پہلی دو عظیم جنگیں ماند پڑ جائیں گی۔ چنانچہ بے جا نہیں کہ ہم بین الاقوامی سطح پر بھی اسی نظم ونسق اور اچھی حکومت کے لیے کوشاں رہیں جو مثلاً سکینڈے نیویا جیسے مقامات پر قائم کیا جا چکا ہے۔

سکینڈے نیویا کی قدیم داستانوں میں شائد ہی کوئی صفحہ تشدد سے پاک ہو اور وہاں آج یہ عالم ہے کہ خواہ سڑک خالی ہو اور کوئی پولیس والا بھی موجود نہ ہو شہری کسی گلی کو پار کرتے ہوئے سرخ روشنی کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ قانون کی یہ پابندی خوف کی پیداوار نہیں بلکہ اس یقین کا حاصل ہے کہ قوانین مفید ہوتے ہیں۔

کسی معاشرے میں موجود تشدد دراصل ایک علامت ہے کہ کہیں کچھ غلط ہے۔ اچھی حکومت کو تشدد، سزائے موت یا بے شمار پولیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جیسے اچھے والدین کو اپنے بچوں کو قابو میں رکھنے کے لیے تشدد نہیں کرنا پڑتا۔ اچھی حکومت کی قوت کا انحصار عوام کی رضا مندی پر ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اچھے والدین کے اختیار کا انحصار بچوں کے دلوں میں موجود ان کی محبت اور عزت پر۔ اچھی حکومت کا قیام معمولی مسئلہ نہیں۔ دنیا میں موجود آج کی اچھی حکومتیں بڑی کوششوں اور غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ اس کے

باوجود ایسی حکومتیں موجود ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسئلہ لاینحل نہیں ہے۔

ہمارا ارتکاز اس امر پر ہونا چاہیے کہ کرۂ ارض کی سطح پر اچھی حکومت کیوں کر قائم ہو۔ یہ مسئلہ انسانی اہلیت سے باہر نہیں۔ انسان بہرحال بہت ذہین ہے۔ درحقیقت موجودہ بحران کی شدت کی ایک وجہ تیز رفتار مادی ترقی ہے جو بجائے خود انسانی ذہانت کا ثبوت ہے۔ انسان نے اپنی ذہانت سے فطرت کے سربستہ رازوں کو جانچا ہے۔ کیا یہی ذہانت عالمی سطح پر اچھی حکومت کے قیام میں بروئے کار نہیں آسکتی۔ انسانی دانش کا ایک اہم حصہ مذہب ہے جسے جنگ سے پاک دنیا کی تعمیر میں برتا جاسکتا ہے۔

دلائی لامہ نے اپنی نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ کتاب "Ancient Wisdom, Modern World" میں لکھا ہے:

''اس وقت اور مستقبل میں بھی جہاں تک نظر آتا ہے اقوام متحدہ غالباً واحد عالمگیر ادارہ ہے جو بین الاقوامی کمیونٹی کی طرف سے اثر انداز ہونے اور پالیسی تشکیل دینے کا اہل ہے۔ بلاشبہ بہت سے لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں کہ یہ غیر موثر ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وقتاً فوقتاً ہم اس کی قراردادوں کو غیر موثر ہوتا دیکھتے ہیں اور انہیں نظرانداز بھی کردیا جاتا ہے۔ اس کی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود میں نہ صرف اس کے اساسی اصولوں کا احترام کرتا ہوں بلکہ 1945ء میں قیام کے بعد سے اس کے کئی کاموں کا معترف بھی ہوں۔ ہمیں اپنے آپ سے فقط یہ پوچھنا ہے کہ آیا اس نے کئی احتمالی خطرناک حالات سے نمٹ کر لوگوں کی جانیں نہیں بچائیں۔ کیا اس طرح ثابت نہیں ہوا کہ عام خیالات کے برعکس یہ بے اختیار نوکر شاہی نہیں ہے۔ اس کے تحت چلنے والی یونیسف، UNHCR یونیسکو اور WHO جیسی تنظیموں کی خدمات کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا۔''

''اگر اقوام متحدہ کو اس کی تمام تر امکانی قوت دے دی جائے تو یہ انسانیت کی خواہشوں کو پورا کرنے کی اہل ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ ابھی تک عالمی ضمیر کے ظہور کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ بہت بھاری

MashalBooks.org

مشکلات کے باوجود ہم اسے دنیا کے بے شمار حصوں میں سرگرم دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ابھی تک سرگرمیوں کی رہنمائی ایک دو اقوام کے ہاتھ میں ہے۔''

عالمی مسائل کے حل میں مذہبی قیادت کے کردار کی ایک اور مثال عزت مآب پوپ جان پال ثانی کی ہے۔ 25 دسمبر 2002ء کے کرسمس خطاب میں پوپ نے کہا کہ مشرق وسطیٰ میں قیام امن کی کوششوں کی فوری ضرورت ہے تاکہ وہاں سلگنے والے تنازعات کو فوراً ختم کیا جاسکے۔ یہ کام ہماری مشترکہ کوششوں سے ہوسکتا ہے۔ اگرچہ پوپ نے کسی ملک کا نام نہیں لیا لیکن واضح تھا کہ وہ عراق پر امریکہ اور برطانیہ عظمیٰ کے حملوں کا ذکر کر رہا ہے۔ اس امر کی تائید ویٹی کن کے بعض اعلیٰ عہدیداران کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ حفظ ماتقدم کی جنگ غیر منصفانہ ہے۔

امن اور اس کی ضرورت کے حوالے سے بیسویں صدی کے تمام رومن کیتھولک پوپ جان پال کے ہم خیال تھے۔ ان سب نے جنگ کے ادارے کی شدید مذمت کی ہے۔ ان میں سے پوپ پال ششم خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے اقوام متحدہ کا دورہ کیا اور کہا، ''مزید کوئی جنگ نہیں۔ آئندہ کوئی جنگ نہیں۔''

جنگ کے خلاف اٹھنے والی ایک اور طاقت ور آواز مذاہب برائے امن ورلڈ کانفرنس نے اٹھائی جس کا پہلا اجلاس اکتوبر 1970ء میں کیوٹو، جاپان، میں ہوا۔ * اس اجلاس میں ایک ہزار ایسے خطروں پر بحث کی گئی۔ اس اجلاس میں بہائی، بدھ مت کے مختلف فرقوں، پروٹسٹنٹ، رومن کیتھولک، آرتھوڈوکس چرچ، کنفیوشس ازم، ہندومت، مسلم، جین مت، سکھ، شنتو اور زرتشت مذہب کے نمائندے موجود تھے۔

مذاہب کی عالمی تنظیم نے تنازعات کے حل کے حوالے سے کئی منصوبے شروع کروائے۔ اسی طرح ہتھیاروں کی روک تھام، عالمی سلامتی، انسانی حقوق اور تعلیم کے لیے اس تنظیم نے اسرائیل میں قائم ہونے والے ایک منصوبے ''کامن ویلیوز_ ڈفرنٹ سورسز'' کو مدد فراہم کی۔ اس تنظیم کے مقصد میں یہودی، مسلم اور مسیحی مقدس کتب کا مطالعہ اور ان سے

* WCRP کی عالمی اسمبلیوں کے اجلاس بعد ازاں بیلجیئم، پرنسٹن (1979ء)، نیروبی (1984ء) ملبورن (1989ء) اٹلی (1994ء) اور اردن (1989ء) میں منعقد ہوئے۔

MashalBooks.org

مشترکہ اقدار کا اخذ شامل تھا جسے بعد ازاں کمرۂ جماعت میں بطور کتاب استعمال کیا جانا تھا۔ انگلینڈ اور جرمنی میں بھی اس تنظیم کے تحت نصابی کتابوں کا جائزہ لیا گیا اور دیکھا گیا کہ ان معاشروں کے لیے اجنبی مذاہب کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

پولینڈ اور سپین میں نیدرلینڈ کے سابقہ سفیر اور ڈبلیو سی آر پی (WCRP) کے اعزازی صدر ڈاکٹر آئٹز کا خیال ہے کہ اقتصادی اصلاحات کے بغیر عالمی امن قائم نہیں ہوسکتا۔ وہ لکھتا ہے:

> ''معاملہ صرف اقتصادی انصاف کا نہیں بلکہ سیاسی انصاف کا بھی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال مشرق وسطیٰ کی صورت حال ہے۔ اقتصادی دنیا میں بھی انصاف لازم ہے جس کی آبادی کے کل پانچویں حصے کو اعلیٰ معیارِ حیات میسر ہے جبکہ آبادی کا باقی پانچواں حصہ خوف ناک غربت میں گزر کرتا ہے اور لاکھوں انسان ہر سال بھوک سے مرجاتے ہیں۔ شمال اور جنوب کا یہ فرق ہر سال بڑھ رہا ہے۔''

ہمارے موجودہ اقتصادی نظام میں کارفرما اور نمایاں اسطوروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

1- ''یہ تصور کہ ہر شخص کی مادی ضروریات بے انتہا ہیں، ہمیں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہا جاتا ہے اور یہ تعلیم کسی مذہب میں نہیں دی گئی۔ خود شکستگی کا یہ پروگرام انسانیت کے خلاف ہے۔ ''عہدنامہ جدید'' کی اس تعلیم میں کوئی ابہام نہیں کہ تم صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہماری زیادہ عمیق ضروریات کا تعلق مادی ساز وسامان سے نہیں بلکہ باطنی نشوونما سے ہے۔

2- لامحدود اضافہ اقتصاد۔ ''میری کمپنی اور میری تنخواہ سب میں اضافہ ہونا چاہیے۔ ہمارا سیارہ محدود ہے اور اس میں لامحدود اضافوں کا تصور قطعی غیر منطقی بات ہے۔ اضافے اور بڑھوتری کے اس تصور نے شدید ماحولیاتی نقصان کو جنم دیا ہے۔''

3- آزاد مارکیٹ کے تصور کی پرستش۔ ''میں خود آزاد مارکیٹ کے حق میں ہوں لیکن ایسی آزاد مارکیٹ جسے سماجی اور انسانی حالات کا درست تناظر میسر ہو۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ منڈی میں جنگل کے قانون سے بچا جائے۔''

MashalBooks.org

امن کے لیے اٹھنے والی مذہبی آوازوں کا تذکرہ کوئیکروں کی تنظیم "Religeous Society Of Friends" کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کسی بھی صورت میں جنگ میں تعاون کو تیار نہیں۔ اگرچہ یہ لوگ مسیحی اخلاقیات کے اتباع میں جنگ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود جنگ کا شکار ہونے والوں کی مدد میں سرگرم رہتے ہیں۔ 1947ء کا نوبیل امن انعام ''فرینڈز سروس کونسل'' اور ''امریکی فرینڈز سروس کمیٹی'' کو دیا گیا۔

مہاتما گاندھی، کنگ اور نیلسن منڈیلا کے عدم تشدد، دلائی لامہ کی تحریروں، پوپ جان پال ثانی اور دیگر پوپوں کے پیغاموں، کوئیکروں کی جنگ سے لاتعلقی اور مذاہب برائے امن عالمی کانفرنس کے منصوبوں سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی مذاہب میں جنگ کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس مقصد کے لیے اٹھنے والی مذہب کی آواز مستقبل میں مزید طاقت ور ہوجائیگی۔ ہر ہفتے پوری دنیا میں اجتماعات ہوتے ہیں اور ان میں اخلاقی مسائل پر وعظ بھی دیئے جاتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر جنگ کے ادارے اور عالمی انسانی بھائی چارے کے اصول کے مابین شرمناک تضاد پر کوئی بات نہیں ہوتی۔ جنگ بہرحال ایک اخلاقیاتی مسئلہ ہے اور تاریخ کے اس نازک موڑ پر جب انسان اپنے ہاتھوں تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے ہمارے مذہبی رہنماؤں کو اس مسئلے کے حل کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح مذہب سماجی بیماری کا حصہ بننے کی بجائے اس کا علاج بن جائے گا یعنی اسے بالآخر مسئلے کا حصہ نہیں بلکہ اس کے حل کا حصہ بننا ہوگا۔

MashalBooks.org

5

سائنس کی بدولت جنگ کی ہیئت میں آنے والی تبدیلی

اگرچہ ہمارے جذبات آج بھی اپنے دور دراز کے اجداد جیسے ہیں۔ لیکن ثقافتی ارتقا کے سبب انسانی زندگی کے حالات ڈرامائی طور پر بدل گئے ہیں۔ نیم مذہبی قومیت اور جنگ کا سبب بننے والے قبائلی جذبات آج بھی ہمارے اندر موجود ہیں۔ لیکن سائنس نے جنگ کی ماہیئت بدل دی ہے۔ قومیت پرستی اور جنگ دونوں انتہائی خطرناک رویے بن چکے ہیں۔

جدید ہتھیار اور نوآبادکاری

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سائنس کی تیز رفتار ترقی اور اس پر مبنی صنعت نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ جب یورپی ممالک کی فیکٹریوں نے سستی مصنوعات کے ڈھیر لگائے تو عالمی تجارت کے طے شدہ طریقے بدل گئے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ایشیا کو جانے والے تجارتی راستوں کے ذریعے مصالحے، پارچہ جات اور سامان تعیش یورپ آیا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کا سوتی کپڑا اور دیگر نفیس پارچہ جات انگلینڈ درآمد کرتا تھا۔ کاتنے اور بننے کی مشین بنی تو تجارت کا رخ الٹ گیا۔ انگلینڈ میں تیار ہونے والا سستا کپڑا

MashalBooks.org

ہندوستان میں فروخت ہونے لگا اور ہندوستان کی کپڑے کی صنعت بیٹھ گئی۔ خود انگلینڈ میں ایک صدی پہلے کھڈی کا یہی حال ہوا تھا۔ مغرب میں ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے اہل تورپ کو باقی دنیا پر عسکری برتری دلوائی۔ اپنے برتر اسلحہ کا سہارا لے کر صنعتی قوموں نے بڑی تیزی سے دنیا کو اپنی نوآبادیوں میں بدل دیا۔ یہ ملک ان کالونیوں سے خام مال لیتے اور وہاں اپنی مصنوعات بیچتے تھے۔ پورے براعظم امریکہ میں مقامی آبادی اہل یورپ کی چیچک جیسی بیماریوں کا شکار ہو کر تقریبا صاف ہو گئی۔ باقی ماندہ انڈین یورپیوں کے ریلے کے سامنے نہ ٹھہر پائے اور مغرب کی طرف پسپا ہو گئے۔

صنعتی اقوام نے اکثر اپنے ارادے بحری گولہ باری کے ذریعے مسلط کئے۔ 1854ء میں کموڈور پیری نے ٹوکیو پر بمباری کی دھمکی دے کر جاپان کو غیر ملکی تاجروں کو قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ 1856ء میں برطانوی بحری جہازوں نے یورپی باشندوں کے ساتھ بدسلوکی کی سزا میں کینٹین پر بھاری بمباری کی۔ 1882ء میں سکندریہ اور 1892ء میں زنجبار پر بمباری کی گئی۔ نوآبادکاری کے اس عمل میں ایک پختہ کار روایتی تمدن برباد ہوا اور یوں اصل خوبصورتی اور قابل قدر شے کھو گئی۔ اور اس کی جگہ جدید صنعتی تمدن کی ذمہ دار قوت اور ترغیب نے لے لی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے امریکیوں اور یورپیوں کے لیے ترقی ایک مذہب تھا اور امپیریل ازم ایک مقدس جنگ۔

1800ء اور 1875ء کے درمیان اہل یورپ کے زیر تسلط زمین کے رقبے میں 35 سے 67 فیصد کا اضافہ ہوا۔ 1875ء سے 1914ء تک نوآبادکارانہ توسیع کی ایک نئی لہر چلی۔ اور نوآبادکار قوتوں کے زیر تسلط رقبے میں 85 فیصد تک اضافہ ہوا۔ صنعتی ممالک کے پاس موجود اسلحہ انہیں غیر صنعتی ممالک پر برتری دلواتا رہا۔ برطانوی شاعر ہلیری بیلوک نے کہا تھا:

جو بھی ہو، ہمارے پاس
میکسم گن* ہے اور ان کے پاس نہیں

* میکسم گن (Maxim Gun) دنیا کی پہلی خودکار مشین گن تھی۔ اسے 1884ء میں ہرم ایس میکسم (Hiram S. Maxim) نے ایجاد کیا۔ ایک آباد کار اور مہم جو ہنری مارٹن سٹینلے نے اس مشین گن سے بڑی امیدیں وابستہ کر لیں۔ اس نے اس ہتھیار کی آزمائش کے دوران ایک منٹ میں چھ سو فائر کئے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہتھیار بربریت پر تہذیب کی فتح میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

MashalBooks.org

1880ء اور 1914ء کے درمیانی وقفے میں برطانیہ کی صنعتی اور نوآبادیاتی اجارہ داری کو چیلنج درپیش ہوا۔ برطانیہ سے نکل کر صنعت کاری بلجیئم، جرمنی اور جاپان تک پھیل گئی۔

1914ء تک جرمنی برطانیہ سے دوگنا فولاد بنا رہا تھا اور ریاستہائے متحدہ چار گنا۔ اسلحہ سازی میں نئے طریقے سامنے آئے اور دنیا کی بڑی صنعتی قوتوں کے مابین بحری اسلحہ بندی کا مقابلہ شروع ہوا۔ انگریزوں کو پتہ چلا کہ ان کی پرانی بحریہ فرسودہ ہو چکی ہے۔ انہیں اپنی بحریہ کی تعمیر نو کرنا پڑی۔ 1880ء سے 1914ء تک نو آبادکارانہ توسیع چلتی رہی اور جنگی تیاریوں کا تناؤ بھی باقی رہا۔ ہر صنعتی ملک چاہتا تھا کہ دنیا کا بڑے سے بڑا حصہ ہتھیا لے۔ صنعتی اور نوآبادکاری کی مطابقت بھی پہلی جنگ عظیم کی صورت میں نمودار ہوئی۔

جنگ عظیم دوم کے اواخر میں اقوام متحدہ بنی تو فوجی قوت کے قانون کو ہٹانے کے لیے بین الاقوامی قانون کا ایک نظام قائم ہوا۔ قانون اپنی اصل میں مساوات کا میکنزم ہے۔ کم از کم اصولی طور پر قانون کے تحت کمزور اور طاقت ور برابر سمجھے جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے بنیادی مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ جنگ کو غیر قانونی قرار دیا جائے اور اگر جنگ غیر قانونی ہے تو پھر طاقت ور اور کمزور دونوں برابر ہیں۔ چونکہ یہ قانون طاقتور پر حد لگاتا ہے چنانچہ وہ اس طرح کے بین الاقوامی قانون کی مخالفت کرے گا۔ مخالفت کے باوجود اقوام متحدہ نے نوآبادکاری کا عہد ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی۔ شائد اس کامیابی کی ایک وجہ سرد جنگ کے دوران مشرق اور مغرب کے درمیان قائم ہونے والا طاقت کا توازن بھی تھا۔ سابقہ نوآبادیوں نے یکے بعد دیگرے آزادی حاصل کر لی۔

جدید ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی

امریکی خانہ جنگی میں پہلی بار پیچھے سے بھری جانے والی بندوقیں اور Repeating Rifles استعمال ہوئیں۔ یورپ سے لوگ ان کی ہلاکت خیزی دیکھنے آئے۔ شمال اور جنوب کی فوجوں میں کوئی 38,67,000 لوگ شامل تھے جو اس وقت کی امریکی آبادی کا 11 فیصد تھا۔ جنگ کے آخر تک کوئی ایک ملین لوگ ہلاک یا زخمی ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کسی جنگ میں ہلاکت کا یہ تناسب نہیں رہا تھا۔ طرفین میں سے کسی کو اس طرح کی توقع نہیں تھی۔ طرفین نے ایک مختصر سی جنگ کی توقع میں آغاز کیا تھا لیکن ٹیکنالوجی نے جنگ کی ماہیت

بدل کر رکھ دی تھی۔ پہلی جنگ عظیم نے اس امر کو اور بھی واضح کر دیا کہ جنگ کا رومانوی تصور ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ 1914ء میں جنگ شروع ہوئی تو لاکھوں نوجوان ذہن میں حب الوطنی، شجاعت اور ہیرو ازم کے تصورات لیے جنگ میں شامل ہوئے۔ لیکن تمام تر توقعات کے برعکس انہیں نم ناک خندقوں، سڑتے زخموں، گولہ باری کی گمنام موت، خاردار تاروں اور زہریلی گیس سے واسطہ پڑا۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران 65 ملین سپاہی متحرک ہوئے۔ جنگ ختم ہوئی تو ان میں سے 37.5 ملین زخمی، ہلاک یا گم ہو چکے تھے۔ بعض ممالک میں ہلاکت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ آسٹریا۔ ہنگری کی فوج میں 7.8 ملین سپاہی شامل تھے۔ اس کے سات ملین فوجی ہلاک ہوئے۔ یعنی کوئی 90 فیصد فوج ماری گئی۔ جرمنی، روس، فرانس اور رومانیہ کی ہلاکتوں کا تناسب بالترتیب 78,76,75 اور 71 فیصد تھا۔

جنگ عظیم دوم میں بھی اتنے ہی سپاہی ہلاک ہوئے لیکن ہلاک ہونے والے شہریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اکیلے سوویت یونین میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی 20 ملین ہلاک ہوئے۔ مرنے والے شہریوں کی زیادہ تر تعداد بھوک اور بیماری سے مری۔ لندن، ناٹر ڈیم، وارسا، ڈریسڈن، کولون، برلن، ٹوکیو، ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے بڑے شہروں پر ہونے والی بمباری نے بھی بڑی ہلاکت مچائی۔

کیمیائی ہتھیار

جدید کیمیائی ہتھیاروں کو پہلی بار جنگ عظیم اوّل میں برتا گیا۔ جرمنوں نے اتحاد یوں کے خلاف کلورین گیس استعمال کی۔ 22 اپریل 1915ء کو بلجیم کے ایک گاؤں پر پہلی بار کیمیائی حملہ ہوا۔ دو دن کے بعد اسی طرح کا ایک اور حملہ کیا گیا۔ ان دو حملوں میں 5 ہزار اتحادی سپاہی مارے گئے اور 15 ہزار زخمی ہوئے۔ جنگ کے خاتمے تک فریقین نے کلورین، مسٹرڈ، فاسجن گیس بھاری مقدار میں برتی۔ گیس سے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد 92 ہزار تھی جبکہ 1.3 ملین زخمی ہوئے۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران ولفریڈ اوون نے ان ہتھیاروں کے استعمال پر بالخصوص طاقت ور نظمیں کہیں۔ اس حوالے سے اس کی نظم "Dulce et Decorum est" بہت مشہور ہوئی۔* وہ جنگ کی تنقید کا نشانہ بنا۔ 1925ء میں جینیوا

* ہوریس کی کہنا ہے کہ (اپنے ملک کے لئے مرنا) شیریں ہے اور عین مناسب بھی۔

MashalBooks.org

پروٹوکول پر دستخط ہوئے اور قرار پایا کہ میدان جنگ میں سانس روک زہریلی اوراعصاب شکن گیسوں اور جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

آغاز میں معاہدہ پر 130 ممالک دستخط کر چکے ہیں۔ تاہم جنیوا پروٹوکول نامی یہ قرارداد کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کی تیاری اور ذخیرہ اندوزی سے منع نہیں کرتی اور نہ ہی یہ ان کے استعمال کی دھمکی سے روکتی ہے۔

جنگ عظیم دوم سے پہلے اور اس کے دوران جرمنی نے نئی ایجاد ہونے والی اعصاب شکن گیسوں کی بہت بڑی مقدار بنائی اور ذخیرہ کی۔ جنگ کے آغاز میں جرمنی کے پاس اعصاب شکن گیس ٹبین (tabun) کے بیس تا تیس ہزار ٹینک موجود تھے۔اس کی فیکٹری سالانہ 12 ہزار ٹن گیس بنا سکتی تھی۔ جرمنی میں ردعمل کے خوف سے یہ مہلک گیس اتحادی دستوں پر استعمال نہیں کی۔ تاہم اسے نسل کشی کے لیے عقوبتی کیمپوں میں استعمال کیا گیا۔ جنگ کے اواخر میں گیس کے یہ ذخائر مختلف اتحادی اقوام کے قبضے میں آئے اور انہیں خفیہ لیبارٹریوں میں لے جا کر مطالعہ کے لیے رکھا گیا۔ باہمی بداعتمادی کے سبب اس طرح کے مہلک ہتھیاروں کی تیاری اور ترقی جاری رہی۔ جنگ دوم کے دوران برطانیہ، کینیڈا، فرانس، جرمنی، ہنگری، اٹلی، نیدرلینڈز، پولینڈ، جنوبی افریقہ، ریاستہائے متحدہ اور سوویت یونین میں بھاری مقدار میں مسٹرڈ گیس موجود تھی۔ اسے اٹلی نے ایتھوپیا میں اور جاپان نے چین میں برتا۔ ساٹھ کے عشرے میں عراق نے ایران پر چلایا۔ یہ گیس ایک تیل نما مائع ہے جو جلد کے ساتھ مس کرنے پر اسے نقصان پہنچاتی ہے اور گرم موسم میں فوراً بخارات میں بدل جاتی ہے۔ یہ گیس جسمانی بافتوں کو نقصان پہنچا کر اندھا پن پیدا کرتی ہے اور پھیپھڑے گل جاتے ہیں۔

1952ء میں برطانیہ نے کرم کشی کے حوالے سے ایک اعصاب شکن گیس بنائی جسے vx کا نام دیا گیا۔ یہ گیس امریکہ میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوئی۔ 1968ء میں جب اٹاوہ میں واقع ایک پلانٹ سے اس گیس کی تھوڑی سی مقدار لیک ہو کر قریبی قصبے میں پہنچی اور چھ ہزار بھیڑیں مر گئیں تو اس کی پیداوار بند کی گئی۔

ویت نام کی جنگ میں امریکہ نے ایجنٹ پرپل، ایجنٹ اورنج، ایجنٹ بلیواور ایجنٹ وائیٹ کے نام سے کئی نباتات کش مادے استعمال کئے۔ نتیجتاً نہ صرف زمین کے وسیع

علاقے کاشت کاری کے لیے غیر موزوں ہوگئے بلکہ انسانوں میں کینسر اور پیدائشی نقائص جیسے مسائل سامنے آئے۔ مارچ 1988ء میں عراق نے ایران کے خلاف زہریلی گیس برتی۔ اس نے یہ گیس عراقی کرد شہریوں کے خلاف بھی استعمال کی۔ حلب جانامی قصبے میں پانچ تا آٹھ ہزار لوگ مارے گئے۔ عراق نے جنیوا پروٹوکول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ گیس ایران کے خلاف بھی استعمال کی۔ بین الاقوامی برادری نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی، برطانوی اور ان کے اتحادی صدام حسین کو ایران کے خلاف دیوار خیال کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صدام حسین کو اسی مقصد کے لیے مسلح کیا گیا تھا۔

3 ستمبر 1992ء کو جنیوا میں اسلحہ بندی پر ہونے والی ایک کانفرنس میں کیمیائی ہتھیاروں کی تحقیق، تیاری، ذخیرہ اندوزی اور استعمال پر پابندی کا کنونشن منظور ہوا جسے کیمیکل ویپن کنونشن (CWC) کہا جاتا ہے۔ یہ کنونشن 1997ء سے موثر ہوا۔* اس کے آرٹیکل 1 کے تحت قرار پایا:**

1- کوئی بھی رکن ریاست کسی بھی حالت میں:

(a) کیمیائی ہتھیار حاصل، ذخیرہ یا منتقل نہیں کرے گی اور نہ ہی ان امور میں براہ راست یا بالواسطہ ملوث ہوگی۔

(b) کیمیائی ہتھیار استعمال نہیں کرے گی۔

(c) کسی بھی طرح سے ان ہتھیاروں کے حوالے سے سرگرم ریاستی رکن کی معاونت کرے گی نہ حوصلہ افزائی کرے گی۔

2۔ ہر رکن ریاست اپنے قبضے یا ملکیت یا کنٹرول یا عمل داری میں موجود کیمیائی ہتھیاروں کو کنونشن کی دفعات کے مطابق تباہ کردے گی۔

3۔ ہر رکن ریاست کسی دوسری رکن ریاست میں موجود اپنے کیمیائی ہتھیار کنونشن کی دفعات کے مطابق تباہ کردے گی۔

* 1995ء میں جب CWC کو نافذ العمل قرار دیا گیا تو جاپان کے ایک مذہبی فرقے (Aum Shinriko) نے ٹوکیو کے ایک زیر زمین راستے میں سیرن (Sarin) نامی گیس چھوڑی جس نے ہزاروں جانوں کو نقصان پہنچایا۔

** CWC کے پورے متن کے لیے دیکھیے http://www.opcw.org

MashalBooks.org

4۔ ہر رکن ریاست اپنے قبضے اور انتظام میں یا اپنی عمل داری میں کیمیائی ہتھیار تیار کرے گی۔ فیکٹری یا کارخانہ کنونشن کے مطابق تباہ کردے گی۔

5۔ کوئی رکن ریاست ان گیسوں کو شوروشر اور بدامنی رفع کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال نہیں کرے گی۔

CWC میں اس امر کا اہتمام بھی کیا گیا کہ 2004ء تک انسپکٹروں کی ایک ٹیم ان امور کی تصدیق کی مجاز ہوگی۔ 1600 جائزوں کا پروگرام بنایا گیا جن میں 59 ممالک آتے تھے۔ اس وقت تک تمام معلوم پیداواری فیکٹریاں بند کی جاچکی ہیں اور ظاہر کئے گئے کیمیائی ہتھیاروں کی فہرست سازی ہوچکی ہے۔ تاہم دنیا میں موجود کیمیائی ہتھیاروں کی کل مقدار یعنی ستر ہزار میٹرک ٹن کا صرف 12 فیصد تباہ کیا گیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل میں CWC پوری دنیا میں موجود کیمیائی ہتھیاروں کے ذخائر تباہ کردے گی۔

حیاتیاتی ہتھیار: چیچک کا معاملہ

1347ء سے 1352ء تک پھیلنے والی طاعون کی وبا کو تاریخ میں ''بلیک ڈیتھ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حیاتیاتی ہتھیاروں کے استعمال کی اوّلین مثال تھی۔ 1346ء میں کافا (Kaffa) میں [اب فودوسا(feodossa)] یوکرائن کا محاصرہ کرنے والے تاتاری سپاہیوں نے منجنیقوں پر چڑھا کر طاعون سے مرنے والوں کی لاشیں شہروں میں پھینکیں۔ شہری طاعون کا شکار ہوئے اور شہر فتح ہوگیا۔ یہاں کے باشندے اٹلی کو پسپا ہوئے تو طاعون بھی وہاں گیا اور یوں پھیلنے والی طاعون کی وبا میں یورپ کی ایک تہائی آبادی مرگئی۔ یہ کیمیائی ہتھیاروں کا اولین استعمال تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ ان ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کا کیا عالم ہوگا۔ ایک بار ہوا میں پھینک دیئے جانے کے بعد ان کے پھیلاؤ کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ حیاتیاتی ہتھیار انسان کی جودت طبع کے ساتھ اس کی فطرت کے تاریک ترین پہلوؤں کے عکاس ہیں۔ حیاتیاتی ہتھیاروں کو خلائی عہد کی سائنس اور حجری عہد کی سیاست کا حقیقی ملاپ کہا جاسکتا ہے۔

صرف بیسویں صدی میں چیچک سے 300 ملین لوگ ہلاک ہوئے۔ اس بیماری سے متاثر ہونے والوں کی ایک بھاری تعداد مری اور باقی بے شکل ہوگئے۔ جب نوآبادکار

MashalBooks.org

سپین نے وسطی اور جنوبی امریکہ فتح کیا تو چیچک انجانے میں حیاتیاتی ہتھیار بن گئی۔ ان کی فوجی فتوحات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے ساتھ چیچک اور خسرہ لائے تھے جن سے یہاں کے مقامی باشندے کبھی آگاہ نہ ہوئے تھے۔ چونکہ ان میں اس بیماری کے خلاف مدافعت موجود نہیں تھی۔ چنانچہ وہ جب بھی اہل ہسپانیہ کی لائی بیماری سے متاثر ہوئے ان کی بڑی تعداد ہلاک ہوگئی۔

شمالی امریکہ میں برطانیہ نے چیچک کو منصوبے کے تحت بطور ہتھیار برتا۔ 1763ء میں سر جیفرے ایمہرسٹ شمالی امریکہ میں برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف تھا۔ اس نے کرنل ہنری بوکٹ(Henry Boaquit) کو لکھا، ''کیا چیچک سے محفوظ رہنے والے انڈین قبائل میں یہ بیماری پھیلانے کا کوئی بندوبست ہوسکتا ہے؟ ہمیں ان کا زور توڑنے کے لیے اور ان کی تعداد کو کم از کم کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرنا ہوگا۔'' بوکٹ نے جواباً لکھا، ''میں کوشش کروں گا کہ انہیں کچھ ایسے کمبل بھجواؤں کہ بیماری کی چھوت ان تک پہنچ جائے اور خود اس بیماری سے بچنے کی ترکیب کرلوں۔''

چونکہ مقامی انڈینوں میں اس بیماری کے خلاف مدافعت موجود نہیں تھی چنانچہ چیچک ان کے خلاف ہولناک ہتھیار ثابت ہوئی۔ حیاتیاتی سامانِ جنگ کی اوّلین تاریخ میں چیچک کا کردار بڑا واضح ہے اور اسے انسانی تاریخ کا سیاہ باب کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جدید سائنس نے سب سے پہلے اسی وبائی مرض پر قابو پایا۔ اسی بیماری کے خلاف سب سے پہلی ویکسین تیار کی گئی۔

اٹھارہویں صدی کے یورپ میں چیچک اتنی عام تھی کہ کسی کو اس سے بچنے کی امید نہیں تھی۔ تاہم لوگ چاہتے تھے کہ ان پر ہونے والا حملہ کم شدید ہو۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ اس بیماری سے صحت یاب ہو جانے والے کو دوبارہ چیچک نہیں ہوتی۔

ترکی اور چین میں لوگ بعض اوقات متاثرہ شخص کے پھپھولوں کا مواد لے کر بیماری سے مامون ہوجاتے۔ ترکی میں متعین ایک سفارتکار کی بیوی لیڈی میری مونٹیگ نے اٹھارہویں صدی میں امنیت کا یہ طریقہ یورپ میں متعارف کروایا۔ تاہم امنیت کی یہ قسم خطرناک تھی کیونکہ بعض اوقات اس طرح پیدا ہونے والی بیماری بجائے خود مہلک ثابت ہوتی۔ اور یہ شخص بجائے خود بیماری کے پھیلاؤ کا ذریعہ بن جاتا۔

ایک انگریز معالج ایڈورجینر نے دریافت کیا کہ جن لوگوں کو کاؤپاکس(Cowpox)

ہوجاتی ہے انہیں چیچک نہیں ہوتی۔ کاؤپاکس دراصل چیچک کی نہایت ہلکی شکل تھی۔ جینر نے کاؤ پاکس میں مبتلا ایک خاتون کے پھپھولے سے مواد لے کر خراش کے ذریعے ایک لڑکے کے جسم میں داخل کیا۔ کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد لڑکا صحت مند ہوگیا۔ بعد ازاں اس لڑکے کو چیچک میں مبتلا نہ کیا جا سکا۔ اڑھائی سال تک تحقیق کرنے کے بعد اس نے 1798ء میں اپنے نتائج چھپوائے۔ لاطینی میں کاؤ(Cow) کے لیے مستعمل لفظ (Vacca) کے نام پر چیچک سے امنیت کا یہ طریقہ ویکسینیشن (Vaccination) کہلایا اور بہت جلد عام ہوگیا۔ پورے شاہی خاندان کو ویکسینیشن دی گئی۔ پارلیمنٹ نے مشترکہ ووٹنگ کے ذریعے جینر کو تیس ہزار پونڈ دلوائے جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔

1807ء میں بویریا نے ویکسینیشن لازمی کردی* اور جینر کی سالگرہ کا دن قومی چھٹی قرار پایا۔ روس میں بھی زور وشور سے ویکسینیشن کی گئی۔ ویکسین پانے والے پہلے بچے کو ویکسینوف کا نام دیا گیا اور اسے ریاستی خرچ پر تعلیم دی گئی۔

فرانس میں عظیم کیمیادان اور ماہر جراثیم لوئی پاسچر اور اس کے ساتھیوں نے یہی اصول استعمال کرتے ہوئے وائرس سے پیدا ہونے والی بیماری ہلکاؤ کی ویکسین دریافت کی۔ یوں چیچک پر فتح کئی دیگر بیماریوں کے خلاف جدوجہد کی تحریک ثابت ہوئی۔**

جنگ عظیم دوم کے دوران برطانوی، امریکی سائنس دان چیچک کا جائزہ لینے لگے کہ اسے بطور حیاتیاتی ہتھیار کس طرح برتا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ ہتھیار عملاً ستعمال نہ ہوا۔ 1969ء میں رائے عامہ کے دباؤ میں آکر صدر نکسن نے امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین سے جراثیمی ہتھیاروں کی ترقی، پیداوار اور ذخیرے پر پابندی اور انہیں تباہ کرنے کے معاہدہ پر دستخط کئے۔*** عموماً اس معاہدہ کو حیاتیاتی ہتھیاروں کا کنونشن (BWC) کہا جاتا ہے۔ اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک نے اس پر دستخط کئے ہیں۔

* اس کا محرک امریکی طبیعات داں کاؤنٹ رمفورڈ بنجمن تھامسن تھا۔

** انسانوں اور جانوروں کی بیماری انتھراکس اکثر مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اس کا بیکٹر یا سپود بنا دیتا ہے۔ اور سالوں زندہ رہتا ہے۔ امریکہ اور سابقہ سوویت یونین سمیت کئی ملکوں نے اس بیکٹر یا پر مبنی حیاتیاتی ہتھیار ذخیرہ کرر کھے تھے۔

*** اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ نے ہی ایران کے خلاف استعمال کے لیے انتھراکس کے کلچر صدام حسین کو فراہم کیے تھے۔ 2001ء میں واشنگٹن اور نیویارک میں کئی ہلاکتوں کے ذمہ دار بیکٹر یا بھی غالبًا امریکی فوجی تجربہ گاہوں سے فرار ہوئے ہوں گے۔

MashalBooks.org

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے اپنے ایک پروگرام کے تحت چیچک سے متاثرہ افراد کو حفاظتی ٹیکے لگائے اور یوں اس بیماری کے پھیلنے کے امکانات مسدود کردیئے۔ بیماری کی علامتوں کی تشہیر کی گئی۔ اور اس کے مریضوں کی اطلاع دینے والوں کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا۔ یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور 1977ء میں صومالیہ میں اس کا آخری شکار سامنے آیا۔ دوسال کے انتظار کے بعد (WHO) نے اعلان کیا کہ بنی نوع انساں کو لاحق خوفناک ترین امراض میں سے ایک چیچک ختم کردی گئی ہے۔ یہ کسی بیماری کے ختم ہونے کا پہلا وقوعہ تھا اور یہ کارنامہ بین الاقوامی تعاون اور سائنس کی قوت کے ملاپ سے سرانجام پایا۔ اسے انسانی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

لیکن ہماری نوع مکمل طور پر منطقی نہیں کہی جاسکتی۔ پتھر کے زمانے کی سیاست اور جذبات آج بھی ہمارے اندر ہیں۔ امریکہ اور سوویت یونین نے اس بیماری کے وائرس بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال لیے۔ شائد اس لیے کہ دونوں کو ایک دوسرے پر اعتبار نہیں تھا حالانکہ دونوں (BWC) پر دستخط کر چکے تھے۔ ایسی افواہیں بھی پھیلیں کہ شمالی کوریا، عراق، چین، کیوبا، انڈیا، ایران، اسرائیل، پاکستان اور یوگوسلاویہ سمیت کئی ملکوں نے یہ وائرس محفوظ کر لیے ہیں۔

1989ء میں ایک سینئر سوویت سائنس دان ولادی میر یاسپٹک بھاگ کر برطانیہ چلا گیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ سوویت یونین میں قائم دواسازی کی ایک فرم (bioprparat) دراصل حیاتیاتی ہتھیاروں کے ایک سوویت پروگرام کا ظاہری رخ ہے۔ بعد ازاں اس کی تصدیق اس ادارے کے چیف سائنٹسٹ ڈاکٹر ملی باکوف نے بھی کی جو بھاگ کر 1992ء میں امریکہ پہنچ گیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ چیچک کے جراثیموں کی خاصی خطرناک شکل کو کلچر کیا جاچکا ہے اور انہیں ہتھیار کی شکل دی جارہی ہے۔ نومبر 2001ء میں امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ چیچک کے وائرس پر مبنی اپنے ہتھیار تباہ نہیں کریگا۔

ایک یورپی اخبار نے ابھی حال ہی میں دو نہایت آسودہ کاروباری اشخاص کی تصویر شائع کی ہے۔ دراصل دہشت پسندوں کی طرف سے چیچک کے ممکنہ استعمال کے پیش نظر یورپ میں نئے مدافعتی ٹیکوں کا ایک پروگرام بنایا گیا تھا۔ مذکورہ کاروباری حضرات کو امید تھی کہ ان کی کمپنی کو اس طرح استعمال ہونے والی ویکسینیشین کی تیاری کا ٹھیکہ ملے گا۔ انسان نے انتہائی جدید حیاتیاتی تحقیق کے کارنامے جینیاتی انجنیئرنگ میں سرانجام دیئے ہیں۔ ہیومن جینوم پراجیکٹ نامی ایک پروگرام کے دوران انکشاف ہوا کہ انسان میں موجود

ڈی این اے کا ایک خاصہ بڑا حصہ پروٹین سازی میں کام نہیں آتا۔

ڈی این اے کا یہ حصہ جنک (junk) ڈی این اے کہلاتا ہے۔ یہ ڈی این اے مختلف انسانی نسلوں میں الگ الگ ہوسکتا ہے۔ اس حقیقت کو بنیاد بنا کر بعض لوگ ایسے زہریلے مادوں کے امکان پر غور کر رہے ہیں جو صرف مخصوص نسل کے لوگوں پر مہلک ثابت ہوں گے۔ اس طرح کی سوچ انسانی وحدت کے دو اہم اصولوں کے خلاف ہے۔ پہلا یہ کہ بیماری انسان کی مشترکہ دشمن ہے اور اس کے خلاف جدوجہد میں انسان کو متحد ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ تمام انسانوں کو ایک دوسرے کو اپنی برادری کے رکن سمجھنا چاہیے۔ اگر ہمیں اس چھوٹے سے سیارے پر موجود رہنا ہے تو ان اصولوں سے مفر ممکن نہیں۔

بارودی سرنگیں

ابھی اوپر تذکرہ ہوا ہے کہ جنگ کے جدید طریقوں کے سبب مرنے والے شہریوں اور بالخصوص بچوں کا تناسب بڑھنے لگا ہے۔ اگر بارودی سرنگوں سے ہلاک ہونے والوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ دنیا کے غریب ترین ممالک میں کتنے انسان اور بالخصوص بچے اس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یونیسف کے ایک اندازے کے مطابق بارودی سرنگوں کا شکار ہونے والوں میں 30 تا 40 فیصد پندرہ برس سے کم عمر بچے ہوتے ہیں۔ انگولا، افغانستان، کمبوڈیا، بوسنیا، کروشیا، ویت نام، موزمبیق، عراق، صومالیہ، اریٹریا، سوڈان، کولمبیا، چیچنیا، میانمر اور انڈیا بارودی سرنگوں کی ہلاکت کے حوالے سے سرفہرست ہیں۔

آج بھی بیاسی ممالک میں ان پھٹی بارودی سرنگیں موجود ہیں اور ہر سال کوئی بیس ہزار افراد ان کی ہلاک انگیزی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان سرنگوں کی پیداوار سستی ہے اور ایک بارودی سرنگ کوئی تین امریکی ڈالر میں پڑتی ہے۔ انتہائی سستا ہونے کے باوجود یہ سرنگ بہت زیادہ اقتصادی تباہ کاری پھیلاسکتی ہے۔ اسے ہٹانے کا خرچ لاگت سے سوگنا زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ جدید بارودی سرنگ دھاتی ڈیٹیکٹر سے شناخت نہیں ہوتی۔ *

* ایسی امید موجود ہے کہ بارودی سرنگوں کا سراغ لگانے کے لیے جینیاتی تغیر کے حامل پودے اگائے جائیں۔ ڈنمارک میں بارودی سرنگوں سے خارج ہونے والی نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ کے لیے حساس ایک پودے تھیلی کریس (Thaley Crace) پر کام جاری ہے۔ اس پودے کے پتوں کی بدلتی رنگت بارودی سرنگوں کی نشاندہی کردیتی ہے۔

MashalBooks.org

بارودی سرنگ سے کوئی عضو کٹ جائے تو بالعموم علاج بہت مہنگا ہوتا ہے۔ امریکہ کا اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ایک تخمینے میں بتاتا ہے کہ ہر چار شکاروں میں سے صرف ایک مناسب مصنوعی عضو لگوا پاتا ہے۔

یکم مارچ 1999ء کو انسانوں کے خلاف استعمال ہونے والی بارودی سرنگ کے استعمال، پیداوار، ذخیرہ اور انتقال پر پابندی اور موجودہ ذخائر کو تباہ کرنے کے کنونشن پر دستخط ہوئے۔ اس وقت تک 34 ممالک اس معاہدے پر دستخط کر چکے ہیں۔ تاحال امریکہ، روس اور چین نے اس پر دستخط نہیں کئے۔ امریکہ کے پاس دنیا کا بارودی سرنگوں کا چوتھا سب سے بڑا اسلحہ خانہ ہے جس میں ایک کروڑ چار لاکھ سرنگیں موجود ہیں۔

بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار

2003ء میں عراق پر ہونے والے امریکی حملے کے تناظر میں یہ اصطلاح وسیع پیمانے پر استعمال ہوئی اور انہیں (WMD) کا نام دیا گیا۔ یہ اصطلاح انتہائی گمراہ کن ہے کیونکہ یہ کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کو نیوکلیائی ہتھیاروں کے ساتھ منسلک کر دیتی ہے۔ اگرچہ اعصابی گیس اور انتھروکس بھی غیر انسانی ہتھیار ہیں اور ان کا استعمال بھی بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے لیکن ان کی تباہی کا پیمانہ نیوکلیائی ہتھیاروں سے کہیں کم ہے۔ چنانچہ انہیں ایک ہی صف میں نہیں رکھا جاسکتا۔ علاوہ ازیں کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں سے حملے کے ردعمل میں نیوکلیائی ہتھیاروں کا استعمال بھی ایک غلط سوچ ہے اور اس حوالے سے نیٹو کی پالیسی کا ازسرنو جائزہ لینا ضروری ہے۔

MashalBooks.org

6

نیوکلیائی ہتھیاروں کی دوڑ

1896ء میں فرانسیسی طبیعیات داں ہنری بیکرل نے تابکاری کا مظہر دریافت کیا تو نیوکلیائی ہتھیاروں کے ممکنہ استعمال کا تصور پہلی بار سامنے آیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ یورینیم کے مرکبات موٹے کاغذ میں لپٹی فوٹوگرافی کی فلم کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ ان شعاعوں کا کیمیائی تعاملات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ یورینیم کے نیوکلیئس کے ساتھ وابستہ ہے۔

بیکرل کی دریافت نے کلاسیکی طبیعیات کے دو مفروضات کو چیلنج کر دیا۔ ان میں سے ایک مفروضہ یہ تھا کہ ایٹم ناقابل تقسیم ہے اور دوسرا مفروضہ قانون بقائے توانائی کا تھا۔ بعد کے مطالعات سے ثابت ہو گیا کہ تابکار انحطاط کے دوران مادہ توانائی میں بدلتا ہے اور یہ تقلیب آئن سٹائن کی مشہور مساوات $e=mc^2$ کی مطابقت میں ہوتی ہے۔

1917ء میں انگریز طبیعیات داں ارنسٹ ردرفورڈ نے الفا ذرات یعنی ہیلیئم نیوکلیئس کی بمباری کے ذریعے عناصر کی تقلیب میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح کے ایک تجربے میں الفا ذرہ نائٹروجن کے نیوکلیئس سے ٹکرایا تو اس نے یہ ذرہ جذب کر لیا، ایک پروٹان خارج کیا اور یوں دوری جدول میں ایک مقام اوپر چڑھ کر آکسیجن کا نیوکلیئس بن گیا۔ ردرفورڈ کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے صرف ہلکے نیوکلیئسوں پر بمباری کی جا سکتی

MashalBooks.org

تھی۔ بھاری عناصر کے نیوکلیئس پر موجود چارج اتنا زیادہ تھا کہ الفاذرات پیدا شدہ نفوری قوت پر حاوی نہ ہوسکتے تھے۔ 1832ء میں ایک نیا بنیادی ذرہ ردرفورڈ کے ایک معاون جیمز چیڈوک نے دریافت کیا۔ چارج بردار نہ ہونے کے سبب اسے بھاری نیوکلیئس پر بمباری کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اٹلی میں کام کرتے ہوئے انریکوفرمی نے یہ طریقہ استعمال کیا اور 1934ء میں یورینیم کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔

1938ء میں جرمنی میں اوٹوہاہن اور سویڈن اور ڈنمارک میں فرِش اور میٹنر نے نیوکلیئس کی مدد سے یورینیم کے ٹوٹنے کی حتمی تصدیق کردی۔ فرِش اور میٹنر نے آئن سٹائن کی مساوات کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ایک یورینیم ایٹم کے ٹوٹنے میں بیس الیکٹران وولٹ توانائی استعمال ہوتی ہے۔ ایک عام نیوکلیائی تعامل کے مقابلے میں یہ توانائی کوئی سو ملین گنا زیادہ تھی۔

نیل بوہر لیبارٹری واقع کوپن ہیگن میں کام کرتے ہوئے فرش نے دیکھا کہ فشن کے دوران آئیونائزیشن پیدا ہوتی ہے۔ انہی خطوط پر کام کرتے ہوئے فرمی اور دیگر سائنس دانوں نے ثابت کیا کہ یورینیم نیوکلیئس کے ٹوٹنے پر توانائی ہی نہیں بلکہ کئی نیوٹران نکلتے ہیں جو زنجیری تعامل کے عمل میں اردگرد موجود نیوکلیئسوں کو توڑ سکتے ہیں۔ یوں امریکہ اور یورپ دونوں جگہ سائنس دان قائل ہو گئے کہ کم از کم اصولی طور پر نہایت طاقت ور نیوکلیائی بم بنانا ممکن ہے۔

1939ء میں نیل بوہر اور جان اے وہیلر نے دریافت کیا کہ یورینیم کا ایک بہت کم پایا جانے والا آئسوٹوپ یورینیم 235 فشن کا شکار ہوتا ہے اور اگر عام پائے جانے والے یورینیم 238 * سے اس آئسوٹوپ کی مناسب مقدار الگ کرلی جائے تو بم بنایا جاسکتا ہے۔ اس اثنا میں یورپ میں جنگ کی تاریکی چھانے لگی تھی۔

1929ء کا اقتصادی بحران امریکہ سے شروع ہوا اور پورے یورپ پر پھیل گیا۔

* یورینیم کا ایٹمی نمبر 92 ہے۔ اسی لیے اس کے تمام ایٹموں میں پروٹونز اور الیکٹرانز کی تعداد 92 ہوگی۔ البتہ مختلف ایٹموں میں نیوٹرانز کی تعداد مثلاً 143 یا 146 ہوسکتی ہے۔ یہ ایٹم ایک دوسرے کے آئسوٹوپس کہلاتے ہیں۔ چونکہ ان کے کیمیائی خواص ایک جیسے ہوتے ہیں چنانچہ انہیں الگ کرنے کے لیے طبیعی خصائص پر مبنی مشکل اور پیچیدہ طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔

MashalBooks.org

جرمن متوسط طبقہ جو ابھی تک 1923ء کی ضرب سے نہیں سنبھلا تھا ایک اور صدمے کا شکار ہوا۔ اقتصادی انتشار کے شکار جرمن رائے دہندگان سیاسی انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔

29 جنوری 1933ء کو ایڈولف ہٹلر کو چانسلر منتخب کیا گیا اور وہ صدر ہڈنبرگ کی مخلوط کابینہ کا رہنما بنا۔ اگرچہ ہٹلر اس عہدے پر قانونی ذرائع سے پہنچا تھا لیکن اس نے قوت کا مرکز بننے کے لیے غیر قانونی ذرائع اختیار کیے۔ 2 مئی کو ہٹلر کی پولیس نے تمام ٹریڈ یونینوں کے ہیڈ کوارٹر قبضا لیے اور مزدور رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں ممنوع قرار پائیں۔ ان کے اثاثے ضبط اور رہنما گرفتا ر ہوگئے۔ دیگر سیاسی جماعتوں کے اراکین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ یہودیوں کو سرکاری ملازمتوں سے نکالنے کے قوانین پاس ہوئے۔ یہودی شہریوں کا بائیکاٹ ہوا اور ان پر تشدد ہونے لگا۔ 11 مارچ 1938ء کو نازی دستے آسٹریا میں داخل ہوئے۔ 16 مارچ 1939ء کو انریکوفرمی نے واشنگٹن میں حکام کو مطلع کیا کہ ایٹم بم بنانا ممکن ہے۔ اسی دن بوہر اور وہیلر نے یورینیم سے متعلق اپنا مقالہ ایک تحقیقی رسالے کو روانہ کیا اور اسی دن جرمن دستوں نے چیکوسلواکیہ پر حملہ دیا۔

چند دن کے بعد برلن میں چھ ایٹمی طبیعیات دانوں کی ایک کانفرنس میں نیوکلیائی فشن کے مضمرات پر بحث ہوئی۔ فشن کا دریافت کرنے والا اوٹو ہاہن اس اجلاس میں شامل نہیں تھا۔ اسے نازی حکومت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ بعد ازاں اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے یورینیم بم بننے کی کوئی امید نہ تھی اور اگر بم ہٹلر کے ہاتھ لگ جاتا تو میں خودکشی کر لیتا۔

جرمن طبیعیات دانوں کی اس گفتگو کو خفیہ رکھا گیا لیکن اس کی خبر کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر ایس فلگ (Dr.S.Flugge) کو ہوگئی جس نے اس کے متن پر مبنی ایک مضمون "naturunsensenschaften" جولائی کے شمارے میں چھپوا دیا۔ ان مضامین نے امریکی سائنس دانوں میں کھلبلی مچا دی۔ ان کی دلیل تھی کہ اگر نازی اتنا کچھ چھپنے کی اجازت دے سکتے ہیں تو پھر وہ یقیناً ایٹم بم کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔

گرما 1939ء میں ہٹلر پولینڈ پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ برلن میں جرمن ایٹمی طبیعیات دانوں کی دوسری کانفرنس ہو رہی تھی جس کا انعقاد جرمنی کے ہتھیار سازی کے ادارے

MashalBooks.org

نے کیا تھا۔ مزید برآں جرمنی نے چیکوسلواکیہ میں واقع کانوں سے نکلنے والے یورینیم کی فروخت بھی روک دی تھی۔

تاہم اس وقت یورینیم کی فراہمی کا بڑا مرکز چیکوسلواکیہ نہیں بلکہ بلجیم کانگو تھا۔ ہنگری کے ایک طبیعیات داں ہنری زلارڈ نے فرمی کے ساتھ یورینیم کے انشقاق میں پیدا ہونے والے نیوٹرانوں کی تعداد پر کام کیا تھا۔ اسے پریشانی تھی کہ نازی جلد ہی ایٹم بم بنالیں گے۔ اس کی خواہش تھی کہ یورینیم کے بلجیم کانگو کے ذخائر ان کے ہاتھوں سے دور رہیں۔

زلارڈ کو پتہ تھا کہ اس کا سابقہ استاد البرٹ آئن سٹائن بلجیم کی مادر ملکہ کا ذاتی دوست ہے۔ آئن سٹائن اور ملکہ کی ملاقات سالوے کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی اور موسیقی کے مشترکہ شوق کے سبب دوستی میں بدل گئی تھی۔ 1933ء میں جب ہٹلر برسر اقتدار آیا تو آئن سٹائن پرنسٹن کے ایڈوانسڈ سٹڈیز کے سکول میں چلا گیا تھا۔ زلارڈ نے اس سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ زلارڈ نے اسے قائل کرلیا کہ ذاتی وقار اور شاہی خاندان کے ساتھ مراسم کے بل بوتے پر وہ بلجیم کو قائل کرسکتا ہے کہ یورینیم کے ذخائر نازیوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

آئن سٹائن بلجیم کی ملکہ اور بادشاہ کو خط لکھنے پر راضی ہوگیا۔ 2 اگست 1939ء کو زلارڈ نے ایک مرتبہ پھر آئن سٹائن سے ملاقات کی۔ اس بار ہنگری کے دو پناہ گزیں طبیعیات داں ایڈورڈ ٹلر اور ایوجن وگنر بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اس وقت تک زلارڈ کے منصوبے مزید بڑھ چکے تھے۔ اس نے آئن سٹائن کو امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کے نام لکھا ایک خط دکھایا۔ آئن سٹائن نے خط میں سے چند غلطیاں نکالنے کے بعد اس پر دستخط کئے۔ یہ خط کچھ یوں تھا:

''ای فرمی اور ایل زلارڈ کے ایک حالیہ کام کا مسودہ دیکھا تو یہ عین ممکن لگا کہ مستقبل قریب میں عنصر یورینیم توانائی کا ایک اہم ذخیرہ ثابت ہوسکتا ہے۔ صورتحال کے کچھ اہم پہلو ہوشیار رہنے کے متقاضی ہیں اور اگر ضروری ہو تو انتظامیہ کو فوری سرگرم ہونا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی لیے میرا فرض بنتا ہے کہ آپ کی توجہ درج ذیل امور کی جانب مبذول کرواؤں۔ عین ممکن نظر آتا ہے کہ انتہائی طاقت ور قسم کے بم بنا لیے جائیں۔ اس

طرح کا کوئی ایک بم کسی کشتی وغیرہ پر لے جا کر کسی بندرگاہ پر چلا دیا جائے تو پوری بندرگاہ اور اس کے ساتھ لگتا علاقہ تباہ کیا جا سکتا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ جرمنی نے چیکو سلواکیہ کی کانوں سے نکلنے والے یورینیم کی فروخت روک دی ہے اور یوں وہ اس طرح کے منصوبے پر پہلے سے عمل پیرا ہے۔ میرے اس گمان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جرمن کے اسٹیٹ انڈر سیکرٹری کا بیٹا وان وزکر برلن کے قیصر ولہیلم کینسر انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ وابستہ ہے جہاں امریکہ میں ہونے والے کچھ کام کو پرکھا جا رہا ہے۔''

11 اکتوبر 1939ء کو یعنی پولینڈ کی شکست کے تین ہفتے کے بعد روز ویلٹ کے اقتصادی مشیر الیگزینڈر سیچز نے یہ خطوط ذاتی طور پر صدر کے حوالے کئے۔ اپنے مشیر کے ساتھ کچھ بحث مباحثے کے بعد صدر نے رائے دی کہ صورتحال سرگرم ہونے کی متقاضی ہے۔ بعد ازاں جب تقریباً شکست خوردہ جاپان کی شہری آبادی پر ایٹم بم گرایا گیا تو آئن سٹائن کو اس خط پر دستخط کرنے کا بری طرح پچھتاوا لگا۔

اوّلین ایٹمی ری ایکٹر

آئن سٹائن کے خط کے نتیجے میں صدر روز ویلٹ نے یورینیم پر ایک مشاورتی کمیٹی بٹھا دی۔ 6 دسمبر 1941ء کو یعنی پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے سے ایک دن پہلے اس کمیٹی نے ایٹمی توانائی اور ایٹم بموں کے حصول کے لیے سرتوڑ کوششوں کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ خفیہ اطلاعات بھی تھیں کہ جرمنوں نے قیصر ولہیلم انسٹی ٹیوٹ کا ایک بڑا حصہ یورینیم پر تحقیق کے لیے وقف کر دیا ہے اور دوسری وجہ کولمبیا یونیورسٹی میں انریکو فرمی کے گروپ کے حوصلہ افزا نتائج تھے۔

جلد ہی فرمی شکاگو یونیورسٹی میں چلا گیا۔ 2 دسمبر 1942ء کو اس کی زیر نگرانی کام کرنے والی ٹیم نے عام یورینیم میں قابو یافتہ زنجیری تعامل پیدا کر لیا۔ عام یورینیم سے بھرے ڈبوں کے درمیان رکھی گریفائیٹ کی سلاخیں بطور ماڈریٹر استعمال کی گئیں تھیں۔ یہ ماڈریٹر نیوٹرانوں کی رفتار کم کرتے تھے تاکہ انہیں زیادہ موثر بنایا جا سکے۔ اس زنجیری تعامل کو دو طرح سے نہایت اہم خیال کیا گیا۔ یہ نہ صرف نوع انساں کے لیے توانائی کا ایک نیا منبع

تھا بلکہ نیوکلیائی ہتھیاروں کے حصول کا ایک آسان راستہ بھی تھا۔ اس تعامل کی ایک پیداوار پلوٹونیم۔ 239 کو بھی بم بنانے میں برتا جاسکتا تھا۔ بوہر اور وہیلر کے پیش کردہ نظریئے سے پتہ چلتا تھا کہ پلوٹونیم۔ 239 میں یورینیم۔ 235 کی طرح ٹوٹنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یورینیم۔ 235 جیسے نایاب آئسوٹوپ کو الگ کرنے کی بجائے طبیعیات داں عام ملنے والے یورینیم۔ 238 کو نیوکلیائی ری ایکٹر میں چلا کر پلوٹونیم۔ 239 کی مناسب مقدار اکٹھی کر سکتے تھے جسے عام کیمیائی طریقوں سے الگ کیا جاسکتا تھا۔

یہ کام بہت بڑے پیمانے پر ڈوپاں کیمیکل کمپنی نے کیا۔ ہین فورڈ، واشنگٹن، میں دریائے کولمبیا کے کنارے چار بڑے نیوکلیائی ری ایکٹر لگائے گئے۔ دریا کا پانی ان میں سے ہو کر گزرتا اور پیدا ہونے والی حرارت کو ساتھ بہا کر لے جاتا۔

ایٹم بم بنانے کا ایک متبادل طریقہ یہ تھا کہ یورینیم۔ 235 کا نایاب آئسوٹوپ عام پائے جانے والے آئسوٹوپ سے الگ کر لیا جائے۔ اس کام کے تین طریقے موجود تھے۔ ایک تو یہ کہ یورینیم کا گیسی مرکب بنایا جائے اور پھر اسے کسی مسام دار شے میں سے گزار لیا جائے۔ نسبتاً کم وزنی آئسوٹوپ قدرے جلدی گزرے گا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ نہایت بلند رفتار سنٹری فیوج استعمال کئے جائیں۔ تیسرا طریقہ کمیتی سپیکٹروگراف کا تھا۔

آئسوٹوپ کی علیحدگی کے تینوں طریقے آزمائے گئے اور کامیاب ثابت ہوئے۔ گیسی علیحدگی کا طریقہ آزمانے کے لیے اوک رج، ٹینیزی، میں ایک بڑا پلانٹ لگایا گیا۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی، برکلے، میں ارنسٹ او لارنس اور اس کے گروپ نے اپنی بہت بڑی سائیکلوٹران کو کمیتی سپیکٹروگراف میں بدل دیا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ہین فورڈ، اوک رج اور برکلے میں کوئی ڈیڑھ سو لوگ ایٹم بم کے لیے مواد تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کو کام کی حقیقی نوعیت کا علم تھا۔ ایٹم بم کی تعمیر کے لیے ایک خفیہ لیبارٹری جے رابرٹ اوپن ہیمر کی زیر نگرانی نیو میکسیکو کے علاقے لاس ایلموس میں قائم کی گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیلز بوہر سمیت لاس ایلموس کے کئی سائنس دان ایٹم بم کے اخلاقیاتی پہلوؤں کے حوالے سے پریشان ہونے لگے۔ جب منصوبہ شروع ہوا تھا تو ہر کسی کو لگتا تھا کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کے حوالے سے جرمن کافی آگے نکل چکے ہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ وہ تہذیب کو نازی ایٹم بموں سے بچانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ تاہم

MashalBooks.org

1944ء میں جب اتحادی جرمنوں کو شکست دے کر پیچھے دھکیلنے لگے اور جرمن ایٹم بم سامنے نہ آئے تو اس ایقان میں دراڑ پڑنے لگی۔

1943ء میں امریکی فوج کا ایک سپیشل انٹیلی جنس یونٹ قائم کیا گیا تا کہ اتحادی دستوں کے ساتھ مل کر جرمن ایٹم بم منصوبے کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ اس یونٹ کو جنرل گروونز (Groves) کے نام کے یونانی ترجمے پر ایس لوس (Aslos) کا نام دیا گیا۔ اس مشن کا سائنسی ڈائریکٹر ہالینڈ کے پناہ گزیں سائنس دان سیموئل گاؤڈشمڈٹ کو بنایا گیا۔

جب سٹریس برگ پر اتحادیوں کا قبضہ ہوا اور گاؤڈشمڈٹ متعلقہ دستاویزات تک پہنچ گیا تو اس پر واضح ہوا کہ جرمن ایٹم بم کے نزدیک بھی نہیں پہنچ پائے۔ اس نے اپنے ایک فوجی شریک کار کو بڑے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بتایا، ''ہے نا حیران کن بات؟ جرمنوں کے پاس ایٹم بم نہیں ہیں۔ اب ہمیں اپنے بم نہیں چلانا پڑیں گے۔'' لیکن وہ اپنے فوجی ساتھی کا جواب سن کر حیران رہ گیا، ''سیم! اچھی طرح ذہن میں بٹھالو کہ اگر ہمارے پاس اس طرح کا ہتھیار موجود ہے تو ہم استعمال کریں گے۔''

بعد ازاں ثابت ہوا کہ وہ فوجی اچھی طرح جانتا تھا کہ عسکری اور سیاسی رہنماؤں کی نفسیات کیا ہے۔ بدقسمتی سے سائنس دانوں کے پاس خود اپنی چلائی مشین کی حرکت روکنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ ممکن ہے کہ روز ویلٹ نے بم کا استعمال روک دیا ہوتا لیکن اگست 1945ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی میز پر سے آئن سٹائن اور زلارڈ کے خط ملے جو پڑھے نہیں گئے تھے یعنی انہی لوگوں کے خط جنہوں نے چھ سال پہلے روز ویلٹ کو خط لکھ کر ایٹم بم بنانے کی ترغیب دی تھی۔ 1945ء میں یہی دونوں سائنس دان دوبارہ خط کے ذریعے روز ویلٹ پر زور دے رہے تھے کہ جاپان کے خلاف نیوکلیائی ہتھیار استعمال نہ کئے جائیں لیکن یہ خط بہت دیر میں پہنچے۔

روز ویلٹ کی جگہ نیا صدر ہیری ٹرومین آیا جو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس پر کتنی بڑی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ روز ویلٹ کی وفات تک اسے ایٹم بم کے منصوبے کی کچھ خبر نہ تھی۔ اسے ایٹم بم اور اس کے مضمرات کی فہم کا موقعہ نہیں ملا۔

اس کے برعکس بم کے منصوبے کا فوجی کمانڈر جنرل لزلی گروونز پرعزم تھا کہ جاپان کے خلاف بم بہر صورت استعمال ہونا چاہیے۔ اس کی زیر نگرانی امریکی ٹیکس گزاروں کے دو

MashalBooks.org

بلین ڈالر منصوبے پر خرچ ہوئے تھے۔ وہ بے تاب تھا کہ اس پر نہ صرف رقم کے غلط استعمال کا الزام نہ لگے بلکہ جنگ میں فاتح قرار دیا جائے۔

ان حالات میں عین قابل فہم نظر آتا ہے کہ ٹرومین بم کا استعمال نہیں روک سکتا تھا۔ جنرل گروز کے الفاظ ہیں، ''ٹرومین نے ہاں کہی اور نہ ہی ناں؟'' دراصل اس وقت ''ناں'' کہنے کے لیے بہت ہی بڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔

ہیروشیما اور ناگاساکی

6 اگست 1945ء کو صبح سوا آٹھ بجے ہیروشیما پر ہوا میں ایک بم پھاڑا گیا۔ اس کی قوت 20 ہزار ٹن ٹی این ٹی کے برابر تھی۔ سوا دو لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں کوئی ایک لاکھ بم سے ہلاک ہوئے اور باقی ایک لاکھ زخمی۔

شہر کے مرکز میں بعض مقامات پر لوگ پوری طرح بخارات میں بدل گئے۔ فٹ پاتھ جہاں وہ کھڑے تھے صرف ان کی پرچھائیوں کے نشان رہ گئے۔ بہت سے لوگ جو دھماکے یا جھلسنے سے نہ مرے اپنے گھروں کے ملبے میں دب گئے اور بعد ازاں لگنے والی آگ میں ہلاک ہو گئے۔ بچ جانے والے بچوں میں سے کچھ نے ہیروشیما کی تباہی کے حالات لکھے ہیں اور پروفیسر اریٹا اوساڈا نے انہیں مدوّن کیا ہے۔ اس طرح کا ایک حال نیچے دیا گیا ہے جسے ایک گیارہ سالہ لڑکے ہیساٹو ہیٹو نے لکھا ہے:

''5 اگست کی صبح ہم لوگ اپنے بھائی سے ملنے ہیروشیما گئے جو وہاں ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ میرے بھائی نے ایک رات ہمارے ساتھ ایک ہوٹل میں گزاری۔ 6 تاریخ کی صبح میری ماں دروازے کے پاس کھڑی تھی اور بل دینے سے پہلے ہوٹل کے مالک کے ساتھ بات کر رہی تھی اور میں بلی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ تبھی نیلی سفید روشنی کا ایک جھماکا دروازے میں سے اندر آیا۔''

''کچھ دیر بعد مجھے ہوش آ گیا لیکن ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہوٹل کی دو منزلیں گر چکی تھیں اور میں ایک دیوار کے ساتھ ملبے تلے دبا ہوا تھا۔ اگرچہ میں نے رینگ کر ملبے تلے سے نکلنا چاہا لیکن حرکت نہ کر سکا۔ وسطی ستون جس کی گل کاری پر مالک کو اتنا ناز تھا میرے سامنے گرا پڑا تھا۔''

MashalBooks.org

''میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں مر رہا ہوں۔ تب میں نے سنا کہ میری ماں مجھے پکار رہی ہے۔ اس کی آواز پر میں نے آنکھ کھولی اور شعلوں کو اپنی طرف رینگتے پایا۔ میں نے اپنی ماں کو آوازیں دیں۔ مجھے پتہ تھا کہ اگر فوراً نہ بچ پایا تو شعلوں میں زندہ جل جاؤں گا۔ میری ماں نے کچھ جلتے تختے کھینچے اور مجھے بچالیا۔ میں اتنا خوش تھا کہ کبھی بھولوں گا نہیں۔ لگتا تھا کہ کوئی پرندہ کسی پنجرے سے نکل آیا ہے۔''

ہر شے اتنی بدل گئی تھی کہ میں دہشت زدہ ہو گیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ہر طرف آگ لگی تھی۔ قریب سے گزرتے لوگوں کی جلد سرخ تھی جیسے اوپر سے اتاری گئی ہے۔ یہ لوگ چیخ رہے تھے۔ باقی سب مر چکے تھے۔ گلیوں میں پڑی لاشوں، تباہ شدہ گھروں اور کراہتے زخمیوں کے باعث چلنا محال تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کریں۔ میں مغرب کی طرف مڑا تو دیکھا کہ شعلے قریب آ رہے ہیں۔

پانی کے کنارے پہنچا تو لگا کہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہوں جل جانے والے لوگ دریائے کباشی میں چھلانگیں لگاتے اور پھر چیختے ہوئے باہر نکل آتے، ''یہ بھی گرم ہے۔ ان سے تیرا نہیں جا رہا تھا اور وہ ڈوبتے ہوئے مردے کے لیے چلا رہے تھے۔''

1951ء میں یہ حال لکھنے کے کچھ عرصہ بعد ہساٹو ایٹوتا بکاری سے پھیلنے والی بیماری کے سبب مر گیا۔ فوری بعد اس کی ماں بھی اسی علالت میں چل بسی۔

بعد از جنگ نیوکلیائی ہتھیاروں کی دوڑ

ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرنے کی خبر البرٹ آئن سٹائن تک پہنچی تو اس کے دکھ اور پچھتاوے کی حد نہ رہی۔ باقی زندگی آئن سٹائن نے امن کا پرچار کرتے اور انسانیت کو نیوکلیائی ہتھیاروں کے خطرات سے آگاہ کرتے گزاری۔ نیوکلیائی فشن دریافت کرنے والے اوٹو ہاہن نے دو جاپانی شہروں کی تباہی کی خبر سنی تو وہ نو دیگر ایٹمی سائنس دانوں کے ساتھ کیمبرج کے نزدیک واقع ایک گھر میں نظر بند تھا۔ * وہ اتنا مضمحل تھا کہ اس کے ساتھی اس کی خودکشی کی توقع کرنے لگے۔

* اس عمارت میں چھپائے گئے مائیکروفون سے جرمن ایٹمی سائنسدانوں کی گفتگو خفیہ طور پر ریکارڈ کی جاتی تھی۔ اس گفتگو کا ریکارڈ مورخین کو دستیاب ہے۔

MashalBooks.org

اگرچہ اتحادیوں میں سے زیادہ تر نے ایٹم بموں پر مسرت کا اظہار کیا کہ چلو جنگ ختم ہوئی۔ لیکن ناگاساکی اور ہیروشیما میں انسان کی اس بے دریغ تباہی نے دنیا کے دیگر حصوں میں بسنے والے لوگوں کو اور طرح سے متاثر کیا۔ فرانسیسی وجودی فلسفی البرٹ کامیو نے لکھا، ''ہماری تہذیب اپنی دہشت اور حیوانیت کے نقطۂ عروج پر جا پہنچی ہے۔ ہمیں مستقبل قریب میں فیصلہ کرنا ہوگا کہ اجتماعی خودکشی کریں یا سائنسی فتوحات کو قدرے ذہانت سے برتیں۔ انسانیت کے سامنے جس طرح کے خوفناک امکانات موجود ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ امر اور بھی واضح ہو گیا ہے کہ لڑائی صرف امن کے لیے کی جا سکتی ہے۔ اب یہ فقط استدعا نہیں بلکہ سب لوگوں کا اپنی حکومت سے ایک مطالبہ ہے کہ عقل اور جہنم میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔

شکاگو اور لاس ایلموس میں کام کرنے والے سائنس دانوں نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن جب ناگاساکی ہیروشیما کے احوال سامنے آئے تو ان میں بھی احساس جرم پیدا ہونے لگا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے امریکہ برطانیہ اور سوویت یونین کی حکومتوں پر دباؤ ڈالا کہ ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی کنٹرول پر متفق ہو جائیں۔ لیکن یہ سب کوششیں ناکام رہیں اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی دوڑ زور پکڑتی چلی گئی۔

1946ء میں ریاستہائے متحدہ نے ایٹمی توانائی کو بین الاقوامی بنانے کے لیے بیروک (Baruchi) پلان پیش کیا لیکن 1943ء سے نیوکلیائی ہتھیاروں کے اپنے منصوبے پر عمل پیرا سوویت یونین نے اسے مسترد کر دیا۔ 29 اگست 1943ء کو سوویت یونین نے اپنے پہلے نیوکلیائی بم کا دھماکہ کیا۔ 21 ہزار ٹن ٹی این ٹی کے مساوی قوت کا یہ بم ایک نیوکلیائی ایٹمی ری ایکٹر میں بننے والے پلوٹونیم۔ 239 سے بنایا گیا تھا۔ اسی اثنا میں برطانیہ نے بھی اپنے نیوکلیائی ہتھیاروں کی تیاری شروع کر دی تھی۔

سوویت نیوکلیائی بم نے امریکہ میں کھلبلی مچا دی اور صدر ٹرومین نے تھرمو نیوکلیائی بم بنانے کی اجازت دے دی۔ اس بم کا خیال سب سے پہلے 1941ء میں فرمی نے شکاگو میں اپنے شریک کار ایڈورڈ ٹیلر کے ساتھ گفتگو کے دوران پیش کیا تھا کہ ہلکے عناصر کے ایک آمیزے میں یورینیم۔ 235 کا فشن بم چلا کر وہ تھرمو نیوکلیائی عمل شروع کیا جا سکتا ہے جو ستاروں کو توانائی مہیا کرتا ہے۔ اس گفت وشنید کے بعد سے ٹیلر اس مہم کا سب سے بڑا حمایتی

بن گیا تھا۔

31 اکتوبر 1952ء کو امریکہ نے بحرالکاہل میں اپنے پہلے تھرمو نیوکلیائی بم کا تجربہ کیا جس کا دھماکہ 1,04,000 ٹی این ٹی کے مساوی تھا۔ یعنی یہ بم ہیروشیما اور ناگاساکی پر چلنے والے بموں سے چار گنا طاقت ور تھا۔ جلد ہی ان کی نسبتاً ہلکی شکل بھی بنائی گئی جسے ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعے بنایا جاسکتا تھا۔

سوویت یونین اور برطانیہ عظمیٰ بھی بہت پیچھے نہیں تھے۔ 1955ء میں سوویت یونین اور 1957ء میں برطانیہ نے انہی بموں کے تجربے کئے۔ 1961ء میں سوویت یونین نے 58 میگاٹن کے بم کا تجربہ کیا۔ ہیروشیما سے دو ہزار گنا زیادہ قوت کا یہ بم 50 کلومیٹر دور بھی چلایا جائے تو ایک بڑے شہر کو تباہ کرسکتا ہے۔

پچاس کے عشرے کے اواخر میں ریاستہائے متحدہ کی فوجی تحقیق وترقی کے سربراہ جنرل گیون (Gavin) سے سمنگٹن کمیٹی نے سوال کیا، ''اگر ہم نیوکلیائی جنگ میں ملوث ہو جاتے ہیں اور روس پر ایک نیوکلیائی بم اس طرح پھینکتے ہیں کہ چلتی ہوا اس کے اثرات جنوب مشرقی روس پر لے جاتی ہے تو مہلک اثرات کس طرح کے ہوں گے۔'' جنرل گیون کا جواب تھا، ''موجودہ منصوبہ بندی کے مطابق تخمینہ کئی سو ملین اموات کا ہوسکتا ہے۔ انحصار اس امر پر ہے کہ ہوا کی سمت کیا ہے۔ اگر ہوا کا رخ جنوب مشرق کا ہے تو زیادہ تر اموات سوویت یونین میں ہوں گی۔ اگرچہ کچھ جاپانی اور فلپائنی علاقے بھی زد میں آسکتے ہیں۔ اگر یہ ہوا مخالف چلتی ہے تو اثرات واپس مغربی یورپ میں بھی آسکتے ہیں۔ 16 تا 28 اکتوبر کے درمیان کیوبا میزائل کرائسس وقوع پذیر ہوا جس میں دنیا نیوکلیائی جنگ کے قریب پہنچ گئی۔ بحران کے دوران صدر کینیڈی اور مشیروں نے حساب لگایا کہ روس کے ساتھ بھرپور نیوکلیائی جنگ کے امکان پچاس فیصد ہیں۔ حال ہی میں سامنے آنے والی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ کا امکان کینیڈی کے تخمینے سے بھی زیادہ تھا۔

1964ء میں پہلا چینی نیوکلیائی طیارہ ٹیسٹ کیا گیا۔ 1967ء میں چین نے 3.3 میگاٹن کا اپنا پہلا ہائیڈروجن بم آزمایا۔ فرانس نے 1966ء میں فشن بم اور 1965ء میں تھرمونیوکلیئر بم ٹیسٹ کئے۔ لگ بھگ تیس اقوام نیوکلیائی ہتھیار بنانا چاہتی تھیں اور بیشتر اس مقصد کے لیے سرگرمی سے کام کرتی رہیں۔ پوری دنیا میں سرد جنگ کے دوران کوئی

MashalBooks.org

پچاس ہزار نیوکلیائی بم بنائے گئے جن میں تھرمونیوکلیائی ہتھیاروں کی اکثریت تھی۔ ان بموں کی مجموعی قوت بیس ارب ٹی این ٹی کے برابر تھی۔ یعنی ہر مرد و زن اور بچے کے حصے میں کوئی چار ٹن ٹی این ٹی آتا تھا۔

سرد جنگ کا خاتمہ

1985ء میں میخائل گورباچوف سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنا۔ سائنس دانوں کے ساتھ ہونے والی گفت و شنید کے نتیجے میں گورباچوف قائل ہو گیا تھا کہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جاری نیوکلیائی کشاکش اتنی خطرناک ہے کہ لمبا عرصہ جاری نہیں رکھی جاسکتی۔ جلد یا بدیر کسی حادثے یا کسی حسابی غلطی کے سبب بے مثال پیمانے کا حادثہ ہوسکتا ہے۔ گورباچوف سمجھتا تھا کہ سوویت یونین کو اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اپنے اسی ایقان کے تحت اس نے دو لفظ ''گلاسناسٹ'' اور ''پریسٹرائیکا'' متعارف کروائے۔

1986ء کی ملاقات میں امریکی صدر ریگن اور گورباچوف اس نتیجے پر پہنچے کہ دو ممالک کے درمیان تھرمونیوکلیائی جنگ کا خطرہ کم کرنے کے لیے اقدامات کی شدید ضرورت ہے۔ اس موقعہ پر موجود وائیٹ ہاؤس کے چیف آف سٹاف ڈونلڈ ریگن نے اس گفتگو کا ریکارڈ یوں پیش کیا ہے:

''ایک موقع ایسا آیا کہ گورباچوف کہنے لگا، : میں تمام نیوکلیائی ہتھیار ختم کرنا پسند کروں گا۔'' ریگن نے میز پر ہاتھ مارا اور کہا، ''پہلے ہی یہ بات کیوں نہ کہہ دی۔ میں بھی تو یہی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اپنے تمام ہتھیار ختم کرنا چاہتے ہو تو میں بھی تمام ہتھیار ختم کرنے پر آمادہ ہوں۔ ٹھیک ہے! ہم یہ سب ہتھیار ختم کریں گے۔'' گورباچوف نے کہا، ''خوب! بہت اچھے۔ تو پھر آپ ایس ڈی آئی کو لیبارٹری تک محدود رکھیں۔'' ریگن کہنے لگا، ''ایس ڈی آئی تو جاری رہے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایس ڈی آئی کسی صورت بند نہیں ہوگا۔'' یہ پروگرام جس نے بظاہر ریگن اور گورباچوف کو نیوکلیائی ہتھیاروں کے مکمل خاتمے پر پہنچنے سے باز رکھا ریگن کا سٹاروار پروگرام تھا جو اینٹی بیلسٹک میزائل ٹریٹی کی خلاف ورزی تھی اور جس کے تحت راڈاروں، مصنوعی سیاروں اور میزائلوں پر مشتمل ایک پروگرام بنایا جارہا تھا تاکہ

MashalBooks.org

ممکنہ حملہ آور میزائلوں کو مار گرایا جائے۔ گورباچوف نے اپنی اصلاحات کے تحت سوویت یونین کے مختلف علاقوں کو حکومت خود اختیاری دے دی اور پھر وہ جلد ہی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا کہ اب یہ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

سابقہ سویت یونین کے آزاد ہونے والے حصوں نے منڈی کی اقتصادیات متعارف کروانا شروع کر دیں اور حیران و ششدر دنیا نے غیر متوقع تبدیلیوں کا ایک سلسلہ دیکھا۔ 10 ستمبر 1989ء کو ہنگری حکومت نے مشرقی جرمنی کے تارکین وطن کے لیے اپنے دروازے کھول دیئے۔ 9 نومبر کو دیوار برلن گری۔ 22 دسمبر کو برینڈن برگ گیٹ کھولا گیا۔ 3 اکتوبر 1990ء کو جرمنی متحد ہوا اور سرد جنگ ختم ہوئی۔

نیوکلیائی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی پالیسی

سرد جنگ کے دوران نیوکلیائی خطرے کو کم کرنے کے لیے کئی بین الاقوامی معاہدے ہوئے۔ ان میں سے نیوکلیائی عدم پھیلاؤ کا معاہدہ این پی ٹی خاص طور پر اہم تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نیوکلیائی قوت کو پانچ ممالک سے باہر نہ پھیلنے دیا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ غیر نیوکلیائی ریاستیں اپنی نیوکلیائی قوتوں کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کریں اور اس معاہدے کے چھٹے آرٹیکل پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔

اس وقت تک این پی ٹی پر 187 ممالک دستخط کر چکے ہیں۔ 1970ء سے یہ معاہدہ بین الاقوامی قانون کی حیثیت سے نافذ ہے۔ تاہم اسرائیل، انڈیا، پاکستان اور کیوبا اس پر دستخط سے انکاری ہیں۔ شمالی کوریا نے دستخط کرنے کے بعد 1993ء میں اس سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ اسرائیل نے ساٹھ کے عشرے کے اواخر میں امریکی رضامندی اور فرانس کی ٹیکنالوجی سے نیوکلیائی ہتھیاروں کا پروگرام شروع کیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اسرائیل کے پاس سوتا ڈیڑھ سو نیوکلیائی ہتھیار موجود ہیں جن میں نیوٹران بم بھی شامل ہیں۔ اسرائیل کی پالیسی یہ ہے کہ اس کے نیوکلیائی ہتھیار نظر آئیں لیکن وہ ان کے وجود سے انکار کرتا رہے۔

اسرائیل اور فرانس کی مدد سے جنوبی افریقہ نے بھی نیوکلیائی ہتھیار بنا لیے۔ اس نے 1979ء میں یہ ہتھیار بحر ہند میں آزمائے۔ تاہم 1991ء میں اس نے این پی ٹی پر

MashalBooks.org

دستخط کئے اور اپنے نیوکلیائی ہتھیار زائل کر دیئے۔

ہندوستان نے 1974ء میں اپنا پرامن نیوکلیائی دھماکہ کیا۔ 1989ء میں ہندوستانی سائنس دانوں نے لیتھیم۔ 6 آئسوٹوپ خالص حالت میں حاصل کئے جنہیں زیادہ طاقت ور تھرمو نیوکلیائی بم بنانے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ 1988ء میں ہندوستان نے زیرزمین نیوکلیائی دھماکے کئے۔ اس کے پاس کوئی ساٹھ بم موجود ہیں جو زیادہ تر پرامن ری ایکٹروں سے حاصل ہونے والے پلوٹونیم۔ 239 پر مشتمل ہیں۔

ہندوستان کے 1974ء کے ''پرامن'' ایٹمی دھماکے کے بعد سے پاکستان نے نیوکلیائی ہتھیار بنانا شروع کئے۔ پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا، ''عیسائی بم موجود ہے، یہودی بم موجود ہے، اسلامی بم بھی ضرور بنے گا۔ یہ بم بنے گا خواہ ہمیں فاقے کرنے پڑیں اور خواہ گھاس کھانی پڑے۔'' 1970ء میں ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی لیبارٹری نے ایک ڈچ فرم سے یورینیم کی تخلیص کے لیے ضروری تیز رفتار سنٹری فیوج حاصل کر لیے تھے۔ ڈاکٹر قدیر خاں نے لامحدود مالی وسائل اور ہر طرح کے حساب کتاب سے ماورا اخراجات کرتے ہوئے یورپی اور امریکی فرموں سے نیوکلیائی ہتھیار بنانے کے لیے ضروری آلات حاصل کر لیے۔ اس عمل میں ڈاکٹر قدیر خاں انتہائی دولت مند شخص بن گیا۔ چین سے ملنے والی مدد اس پر مستزاد تھی۔ یوں 1998ء میں پاکستان نے اپنے پانچ نیوکلیائی ہتھیار آزمائے۔ آگے پیچھے ہونے والے ان دھماکوں نے دنیا کو خوفزدہ کر دیا کہ کہیں یہ بم کشمیر کے تنازعہ میں استعمال نہ ہونے لگیں۔ پاکستان نے تو اعلان بھی کر دیا تھا کہ اگر روایتی ہتھیاروں کی جنگ چھڑتی ہے تو وہ ابتدائی مراحل میں ہی یہ ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔

پاکستان میں ڈاکٹر خان عظیم قومی ہیرو بن گیا۔ بتایا گیا کہ اس نے نیوکلیائی ہتھیار بنا کر پاکستان کو ہندوستان کے نیوکلیائی حملے سے بچا لیا ہے۔

واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والے ایک مضمون* میں پرویز ہود بھائی نے لکھا، ''حکومت نے ایٹم بم کو نیوکلیائی حب الوطنی کا درجہ دیا اور اسے پاکستان کی اعلیٰ سائنسی کامیابی اور عزت نفس کی علامت بتایا اور ایک نئے مسلم عہد کا سنگ میل ٹھہرایا۔ 1998ء کے بم دھماکوں کے بعد ہندوستان میں بھی اس طرح کی حب الوطنی کی اٹھان دیکھنے میں آئی۔''

* یکم فروری 2004ء

MashalBooks.org

2004ء کے اوائل میں انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر خان سالوں سے لیبیا، ایران اور شمالی کوریا کو نیوکلیائی راز اور آلات بیچتا رہا ہے۔ تاہم مبصرین کو یقین تھا کہ خان پر ان جرائم میں مقدمہ نہیں چلے گا کیونکہ یوں پاکستانی فوج اور سابقہ وزرائے اعظم بھی ملوث ہو جائیں گے۔ مزید برآں ڈاکٹر خان کو پاکستان کے اسلامی بنیاد پرستوں کی معاونت بھی میسر ہے۔

پاکستان کے صدر پرویز مشرف پر ہونے والے حالیہ قاتلانہ حملوں سے خطرہ پیدا ہو چلا ہے کہ یہاں اسلامی بنیاد پرست اقتدار میں آ کر نیوکلیائی ہتھیار دہشت گرد تنظیموں کے حوالے کر دیں گے۔ نیوکلیائی پھیلاؤ کے ساتھ اس طرح کا خطرہ عمومی سطح پر موجود ہے۔ جتنے زیادہ ملکوں کے پاس نیوکلیائی ہتھیار جائیں گے۔ اتنا ہی خطرہ بڑھ جائے گا کہ اگر ان میں سے کسی ملک میں انقلاب آتا ہے تو نیوکلیائی ہتھیار ذیلی قومی تنظیموں کے ہاتھ لگ جائیں گے۔

نیوکلیائی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے کی آٹھویں شق کے تحت قرار پایا تھا کہ معاہدہ کو فعال اور مطلوبہ سمت میں رکھنے کے لیے ہر پانچ سال کے بعد ایک کانفرنس ہوگی۔ 1995ء کی ریویو کانفرنس میں اس کی حیات کو غیر معینہ عرصہ تک بڑھا دیا گیا۔

حالانکہ نیوکلیائی ہتھیاروں کی حامل اقوام نے باہمی بداعتمادی کے مظاہرے کئے تھے۔ اپنے کچھ ہتھیار بے اثر کرنے کے باوجود انہوں نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے حوالے سے کوئی اہم پیش رفت نہیں کی تھی۔ 2000ء کی ریویو کانفرنس میں بھی واضح کیا گیا تھا کہ نیوکلیائی ریاستوں کو اپنے ہتھیار ختم کرنے کے عمل کو غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے عام اسلحہ بندی کے خاتمے کے ساتھ منسلک کرنا چاہیے۔ اسی کانفرنس میں نیوکلیائی ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے تیرہ عملی اقدامات پیش کئے گئے تھے۔ قرار پایا تھا کہ ہتھیاروں کے لیے مطلوبہ مواد کی کمی اینٹی بیلسٹک میزائلوں کی روک تھام، نیوکلیائی اسلحہ خانوں کی جانچ پڑتال اور نیوکلیائی تخفیف سے رجوع کے حوالے سے مبسوط اقدام کئے جائیں۔ اسی طرح کی ایک ریویو کانفرنس 2005ء میں ہونا قرار پائی ہے۔ یاد رہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرانے کی ساٹھویں سالگرہ اسی سال منائی جائے گی۔

2000ء میں سامنے آنے والی ریویو کانفرنس کی سفارشات میں ناقابل رجوع کا تصور خاصا اہم ہے۔ نیوکلیائی ہتھیار کو مکمل طور پر تباہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس میں

MashalBooks.org

استعمال ہونے والے خاص آئسوٹوپ سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اگر تو یہ یورینیم کا مرتکز آئسوٹوپ h.e.u ہے تو اسے عام یورینیم کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ قدرتی یورینیم میں اس کی مقدار 0.7 فیصد ہوتی ہے اور باقی 99.3 فیصد یورینیم کا عام آئسوٹوپ U-238 ہوتا ہے جسے معمول کے حالات میں پھاڑا نہیں جاسکتا۔

اگر ملانے کے بعد پھاڑے جانے کے قابل یورینیم آئسوٹوپ کی مقدار 20 فیصد سے کم ہو جاتی ہے تو اسے نیوکلیائی ہتھیاروں میں نہیں برتا جاسکے گا۔ اسی طرح لیتھیم اور ہائیڈروجن کے کمیاب آئسوٹوپوں کو عام آئسوٹوپوں کے ساتھ ملادیا جائے تو ان سے بھی نجات مل جائے گی۔

پلوٹونیم سے ہمیشہ کی نجات قدرے مشکل ہے۔ اسے بھی کنکریٹ کے بڑے بڑے بلاکوں میں ڈال کر سمندر کے انتہائی گہرے حصوں مثلاً جاپان ٹرنچ میں ڈالا جاسکتا ہے جہاں سے ان کا دوبارہ حصول تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ ایک متبادل طریقہ یہ ہے کہ انہیں انتہائی گہری کانوں کے آخری سروں میں پہنچا کر روایتی دھماکہ کیا جائے اور وہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے۔ لیکن ہتھیاروں کی تخفیف کے کسی معاہدے میں بھی اس طرح کا پروگرام شامل نہیں ہے۔

این پی ٹی کے چھٹے آرٹیکل پر عمل درآمد تو ایک طرف حالیہ برسوں میں خطرناک رجعتی عمل دیکھنے میں آئے ہیں۔ 2000ء کے امریکی انتخابات میں برسراقتدار آنے والے قدامت پرستوں نے بین الاقوامی قوانین، اقدار اور معاہدوں کے متعلق تحقیر کا رویہ اپنایا ہے۔ 2002ء میں بش انتظامیہ نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے متعلق جاری کردہ ایک دستاویز میں نہ صرف نیوکلیائی عدم پھیلاؤ کے معاہدے کا ذکر حقارت سے کیا ہے بلکہ سی ٹی بی ٹی کی توثیق پر بھی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس رپورٹ میں تجویز کیا گیا ہے کہ امریکہ کو اپنے ہتھیار روس، چین، لیبیا، شام، عراق، ایران اور شمالی کوریا پر مرکوز کرنا ہوں گے۔ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اگر مڈل ایسٹ، چین اور تائیوان کے درمیان کشمکش اور جنوبی کوریا پر شمالی کوریا کے حملے کی صورتحال سامنے آتی ہے یا کوئی حیران کن فوجی وقوعہ ہوتا ہے تو یہ ہتھیار استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ حیران کن فوجی وقوعہ ایک مبہم اصطلاح ہے اور اسے کئی رنگ دیئے جاسکتے ہیں۔ مزید برآں بش انتظامیہ نے اسی رپورٹ میں چھوٹے اور قابل استعمال نیوکلیائی ہتھیاروں کے

MashalBooks.org

بنانے کی سفارشات بھی کی تھیں جنہیں آزمانے کی ضرورت ہوگی اور یوں سی ٹی بی ٹی بجائے خود عملاً ہو جائے گا۔ اگر اس طرح کے نیوکلیائی ہتھیار وجود میں آتے ہیں تو ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کے بعد نیوکلیائی ہتھیاروں کے خوف کے حوالے سے وجود میں آنے والی فضا جس نے پچاس سال سے ان کا استعمال روکے رکھا ختم ہو جائے گی۔

اس امر کا خطرہ بھی موجود ہے کہ بش انتظامیہ کی نئی حکمت عملی این پی ٹی کو کمزور کردے گی۔ اس معاہدہ کے دستخط کنندگان کو پہلے سے خدشات لاحق ہیں کہ نیوکلیائی تخفیفِ اسلحہ کے حوالے سے ان ہتھیاروں کی حامل ریاستوں کے عزائم نیک نہیں ہیں۔ یہ ریاستیں پوچھ سکتی ہیں کہ ''اگر ایسی اقوام کو جن کے فوجی اخراجات ہم سب کے مجموعی فوجی اخراجات سے بھی زیادہ ہیں نیوکلیائی ہتھیاروں کی ضرورت محسوس کرتی ہیں تو کیا ہمیں ان کی احتیاج نہیں۔''

بش انتظامیہ کی پالیسی ایک نئی نیوکلیائی دوڑ کو جنم دے سکتی ہے۔ مزید برآں بش انتظامیہ کی یہ نیوکلیائی ریویو رپورٹ نہ صرف این پی ٹی کی خلاف ورزی ہے بلکہ ہیگ کی بین الاقوامی عدالت کی 1996ء کی نیوکلیائی ہتھیاروں کے متعلق مشاورتی رائے کی خلاف ورزی بھی ہے۔ اس رائے پر مزید بحث آگے چل کر ہوگی۔

نیوکلیائی ڈیٹرنس کے تصور میں موجود خامیاں

ڈیٹرنس کے تصور کے دیگر نقائص پر بحث سے پہلے یہ امر قطعی واضح طور پر بیان ہو جانا چاہیے کہ بڑے پیمانے کے نیوکلیائی ردِعمل کا تصور اخلاقیاتی نقطۂ نظر سے کلّی طور پر ناقابل قبول ہے۔ یہ اصول نہ صرف فہم عامہ اور انسانیت کے خلاف ہے بلکہ کسی بھی بڑے مذہب کی اخلاقیات اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بالخصوص عیسائیت کے بنیادی احکام اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ہمسائے سے محبت کا اصول عیسائیت اور بدھ مت دونوں میں بنیادی اہمیت حامل ہے۔

اوپر کے کسی صفحہ میں آپ نے روس پر امریکی ممکنہ نیوکلیائی حملے کے نتیجے میں پیش آوردہ اموات پر جنرل گیون کا تخمینہ دیکھا تھا۔ غور کریں کہ یہ نتائج مسیحی اخلاقیات کے ساتھ کیسے متصادم ہیں۔ جنرل گیون نے کہا تھا: ''موجودہ منصوبہ بندی کو دیکھا جائے تو کئی سو

ملین اموات ہو جائیں گی۔ ہوا کا رخ جنوب مشرق کا ہے تو یہ اموات سوویت یونین میں ہوں گی اور جاپان اورفلپائن تک بھی یورپ کو پلٹ آئیں گی۔''

جنرل گیون کا تخمینہ صرف اس لیے دہشت ناک نہیں کہ مرنے والوں کی تعداد کتنی بڑھی ہے۔ اس کی خوفناکی کا اصل پہلو یہ ہے کہ اس میں مردعورت اور بوڑھے بچے سب بلاتمیز مارے جائیں گے اور اس سے کچھ فرق نہ پڑے گا کہ اس میں کس کا قصور کتنا ہے۔ اس طرح کے حملوں کے نتیجے میں غیر جانبدار ممالک کے کروڑوں لوگ بھی مر جائیں گے۔ جب کسی مشتبہ مجرم پر مقدمہ چلایا جاتا ہے تو اس کے مجرم یا معصوم ہونے کے ثبوت میں بہت سی کوششیں ہوتی ہیں۔ جب تک جرم پوری طرح ثابت نہ ہو جائے سزا نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس نیوکلیائی حملے میں لاکھوں ایسے لوگ مریں گے جن کے متعلق بخوبی علم ہے کہ وہ معصوم ہیں۔

یہاں کہا جاسکتا ہے کہ نشانہ بننے والے کے مجرم یا معصوم ہونے کا مسئلہ جدید جنگ میں کبھی نہیں اٹھایا گیا۔ اور ہتھیاروں میں ہونے والی ترقی کے ساتھ ساتھ مرنے والے افراد میں شہریوں اور بالخصوص بچوں کا تناسب بڑھتا چلا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کے دوران کوونٹری پر ہونے والے ہوائی حملوں یا ڈرسیڈن اور ٹوکیو پر برسائے جانے والے بموں کے نتیجے میں زیادہ تر ہلاکتیں ایسی آبادی کی تھیں جن کے مجرم یا معصوم ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میرے خیال میں اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جدید جنگ ناقابل قبول ہو چکی ہے اور نیوکلیائی ہتھیار اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

نیوکلیائی ہتھیاروں کے حوالے سے 1996ء میں ہیگ کی بین الاقوامی عدالت انصاف نے ایک تاریخ ساز فیصلہ دیا تھا۔ ڈبلیو ایچ او اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے استفسارات کے جواب میں عدالت نے فیصلہ دیا تھا کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کی دھمکی اور ان کا استعمال مسلح تصادم کے حوالے سے موجود بین الاقوامی قوانین کی عمومی خلاف ورزی ہے اور انسانی قانون کے اصولوں اور قوانین کے خاص طور پر برعکس ہے۔ اس عمومی اصول سے صرف ایک ممکنہ استثنا ہوسکتا ہے کہ ذاتی دفاع کے انتہائی حالات میں یہ ہتھیار یا حربہ استعمال کیا جائے۔ لیکن عدالت کا خیال ہے کہ ان انتہائی حالات میں بھی ریاست کے پاس ان ہتھیاروں کے استعمال کا جواز موجود نہیں۔ چنانچہ اس غیر معمولی مقدمے کو بغیر فیصلے کے چھوڑ

دیا گیا۔ تاہم عالمی عدالت نے متفقہ فیصلہ دیا کہ ''باہمی اعتماد اور دیانت داری کے ساتھ اس مقصد کے لیے کوشش کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت ہے کہ نیوکلیائی اسلحہ کو ختم کیا جائے اور اس کے تمام پہلو سخت بین الاقوامی قوانین کے تحت لائے جائیں:

نیوکلیائی ہتھیاروں کی حامل ریاستوں نے اس اہم فیصلہ پر تنقید کرتے ہوئے قرار دیا کہ اسے سناتے ہوئے عدالت نے رائے شماری کا اہتمام نہیں کیا۔ اس عدالت کے سات ججوں نے فیصلہ کے پیراگراف 2 (e) کے خلاف ووٹ دیا تھا جس کی رو سے قرار دیا گیا تھا کہ ریاستوں کی طرف سے نیوکلیائی ہتھیار کا استعمال یا استعمال کی دھمکی غیر قانونی ہے اور صرف واحد استثنا اس وقت بنتا ہے جب کسی ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ سات ججوں نے اس پیراگراف کے حق میں ووٹ دیا تھا جس میں عدالت کا صدر الجیریا کا محمد بجائی بھی شامل تھا۔ عدالت نے قلیل اکثریت سے یہ فیصلہ بحال رکھا۔ مذکورہ بالا پیراگراف 2 (e) کے خلاف ووٹ دینے والوں نے بھی اس لیے مخالفت کی کہ انہیں ممکنہ استثنا سے اختلاف تھا۔ چنانچہ اگر رائے شماری کے اہتمام میں تھوڑا سا مختلف طریقہ اختیار کیا جاتا تو نتیجہ قطعی طور پر مختلف ہوتا۔

باقی چار ججوں نے اس فیصلے کی مخالفت میں ووٹ دیئے۔ ان میں سے تین نیوکلیائی ریاستوں کے نمائندے تھے جبکہ چوتھے کا خیال تھا کہ اس عدالت کو اقوام متحدہ یا ڈبلیو ایچ او کی طرف سے اس طرح کے سوالات نہیں سننا چاہئیں تھے۔ اس کی مخا لفت میں ووٹ دینے والی رکن جج کا تعلق برطانیہ سے تھا اور یہ اس عدالت کی تاریخ میں پہلی خا تون جج تھی۔ اسے پیراگراف 2 (e) میں شامل لفظ بالعموم پر اعتراض تھا اور وہ اس نقطۂ نظر کی حامی تھی کہ اگر مسئلہ کا عمیق تر جائزہ لیا جاتا تو عدالت ہر طرح کے حالات میں ہتھیاروں کے استعمال کو ناجائز قرار دینے کے فیصلے تک پہنچتی۔

چنانچہ نیوکلیائی ڈیٹرنس کا تصور نہ صرف اخلاقیاتی نقطہ نظر سے نا قابل قبول ہے بلکہ بین الاقوامی قانون کے ساتھ بھی متصادم ہے۔ عالمی عدالت کا 1996ء کا مشاورتی فیصلہ اور رائے دنیا کے لوگوں کی اکثریت کی آواز ہے۔ اگرچہ ابھی تک کوئی باقاعدہ رائے شماری نہیں کروائی گئی۔ لیکن اقوام متحدہ میں وقتاً فوقتاً ہونے والے فیصلے یہی ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 4 دسمبر 1998ء کو جنرل اسمبلی نے نیوایجنڈا ریزولیوشن 18 کے مقابلے

میں 107 ووٹوں سے منظور کیا۔* اس قرار داد میں نیوکلیائی اسلحہ کے خاتمے کے حوالے سے کئی عملی اقدامات تجویز کئے گئے اور نیوکلیائی ریاستوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہتھیاروں کا مکمل اور تیز رفتاری کے ساتھ خاتمہ کریں اور یوں نیوکلیائی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے میں موجود چھٹے آرٹیکل کے تحت عائد ذمہ داریاں پوری کرے۔ چنانچہ نیوکلیائی ہتھیار نہ صرف اخلاقیاتی اعتبار سے نا قابل قبول ہیں اور بین الاقوامی قانون سے متصادم ہیں بلکہ جمہوری اصولوں کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتے۔

یہ اہم نکات اٹھانے کے بعد ہم نیوکلیائی ڈیٹرنس کے تصور میں موجود بعض دیگر خامیوں پر توجہ دیں گے۔ اس تصور کی ایک اہم خامی یہ ہے کہ نیوکلیائی جنگ غلطی یا حادثے کے سبب بھی شروع ہوسکتی ہے۔ یہ غلطی ٹیکنیکل بھی ہوسکتی ہے اور انسانی کوتاہی کا نتیجہ بھی۔ یہ امکان اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ ڈیٹرنس خودمختار نظاموں کے ذریعے چند منٹ کے اندر چل جانے کے لیے تیار ہیں۔ یہ خطرہ مستقل موجود ہے کہ ریڈار کی سکرین پر موجود سگنل کی جانچ پرکھ میں ہونے والی معمولی غلطی اس طرح کی جنگ کا آغاز ثابت نہ ہو۔ مثال کے طور پر بی بی سی نے ابھی حال ہی میں رپورٹ دی ہے کہ ماہرین کا ایک پورا گروپ خیال کرتا ہے کہ کوئی چھوٹا سا شہابیہ ہمارے کرۂ ہوائی میں داخل ہو کر پھٹ جائے اور کسی ملک کا ریڈار اسے غلطی سے میزائل سمجھ لے تو جنگ چھڑ سکتی ہے۔

کولن ایس گرے** نے اپنی تشویش کو یوں بیان کیا ہے: ''درحقیقت مسئلہ دیر سے چلا آرہا ہے۔ یوں ہے کہ ہم نے اپنے مستقبل کو ایک ایسے نیوکلیائی نظام کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے جس کی ذرا سی خرابی بھی سہاری نہیں جاسکتی۔'' جنرل کرٹس ای لیمے+ یوں لکھتا ہے، ''میری رائے میں ایک عام جنگ کا آغاز کسی بھی طرف سے بالقصد حملے کی بجائے سیاسی غلطیوں اور حادثوں کے ایک سلسلہ سے ہوگا۔'' بروس جی بلیئر++ نے تبصرہ کیا، ''بڑا واضح امر ہے کہ انتباہ سے فعال ہونے کے فیصلہ تک کا سارا عمل اپنی اصل میں بڑا تیز ہے اور

* نیو ایجنڈا ریزولیوشن کے خلاف ووٹ دینے والوں میں سے دس کا تعلق مشرقی یورپ سے تھا۔ انہیں امید تھی کہ یوں نیٹو میں ان کی شمولیت یقینی ہوجائے گی۔

** پبلک پالیسی کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کا چیئرمین۔ + Brooking Institution

++ امریکہ کی سٹریٹجک ائر کمانڈ کا بانی اور سابقہ کمانڈر انچیف۔

MashalBooks.org

اسی لیے نہایت تباہ کن غلطی کے امکانات موجود ہیں۔ یہ نظام بجائے خود وقوع پذیر ہونے کے منتظر حادثہ کا نام ہے۔''

کوئی شخص پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ اس طرح کا مہلک حادثہ یا انجانا عمل کبھی نہ ہوگا۔ رینڈ کارپوریشن کے فریڈ آئیکل کا کہنا ہے کہ دونوں طرف خشکی اور سمندر میں موجود اور دور تک بکھرے میزائلوں کے نظام پر نظر ڈالیں تو حادثے کا امکان بہت واضح نظر آنے لگتا ہے۔ کسی تکنیکی حادثے یا انسانی غلطی کے سبب باہمی ڈیٹرنس منہدم ہوسکتا ہے۔

نیوکلیائی ڈیٹرنس کے تصور میں ایک بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ دہشت گردوں کے ہاتھوں بم کے استعمال کے امکان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت نیوکلیائی دہشت گردی آج کی دنیا کو لاحق واضح خطرات میں سے ایک ہے۔ یہ خطرہ ریاستہائے متحدہ میں نسبتاً زیادہ ہے۔

1945ء کے بعد سے تین ہزار میٹرک ٹن یعنی کوئی تیس لاکھ کلوگرام بم گریڈ یورینیم افزودہ کی جاچکی ہے جو کئی لاکھ نیوکلیائی ہتھیار بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس میں سے کوئی ایک ملین کلوگرام مواد روس میں موجود ہے جس کی مناسب دیکھ بھال مشکل ہو رہی ہے۔ یہ مواد ایسے اداروں کی نگرانی میں ہے جہاں تنخواہ ناکافی ہے اور رشوت ستانی مشکل نہیں۔ اس امر کا مسلسل خطرہ موجود ہے کہ بم بنائے جانے کے لیے تیار یہ مواد دہشت گردوں، منظم مجرموں یا غیر ذمہ دار حکومتوں کے ہاتھ چڑھ سکتا ہے۔ پاکستان کے بم ساز ڈاکٹر خان کے اعترافات کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ اس مواد اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی ایک پوری بلیک مارکیٹ موجود ہے۔ مزید برآں اگر پاکستان کی کوئی کم مستحکم حکومت انقلاب کا شکار ہوتی ہے تو نیوکلیائی ہتھیاروں کا پورا نظام دہشت گردوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

3 نومبر 2003ء کو ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل محمد البرادی نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے بموں میں استعمال کے قابل مواد کی پراسیسنگ محدود کرنے پر زور دیا۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک ایٹمی ری ایکٹروں کو بین الاقوامی نگرانی میں نہیں دیا جاتا یہ امر ممکن نہیں ہوسکتا۔ جب ہم نیوکلیائی پھیلاؤ اور نیوکلیائی دہشت گردی کے ساتھ وابستہ خطرات دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس طرح کی پابندیاں پہلے کیوں عائد نہیں کی گئیں۔ بدقسمتی سے پرامن مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے نیوکلیائی ری

ایکٹر بھی پلوٹونیم، نیپچونیم اور امیریکیئم جیسے قابل انشقاق آئسوٹوپ پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ تمام نیوکلیائی ری ایکٹروں کو بین الاقوامی کنٹرول میں رکھا جائے۔ ایک سوال یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ آیا نیوکلیائی توانائی کا پھیلاؤ اتنا سودمند ہے کہ اس کے ساتھ وابستہ خطرات مول لئے جائیں۔

اٹلی کے نیوکلیائی طبیعیات داں فرانس کیلوگیرو کا خیال ہے کہ اگر دہشت گردوں کے پاس افزودہ یورینیم فاصل کمیت سے کم ہو تو وہ بآسانی نیوکلیائی بم بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کے بم میں فاصل کمیت کے دو ٹکڑوں کو کسی بھی نالی میں رکھ کر روایتی دھماکو مواد کی مدد سے باہم ٹکرایا جائے تو کسی بھی بڑے شہر کے مرکز میں ایک لاکھ سے زائد لوگ ہلاک کئے جا سکتے ہیں۔

ہمیں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر نائن الیون کے وقوعہ پر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کا تبصرہ نہیں بھولنا چاہیے۔ اس نے کہا تھا، ''اس بار یہ نیوکلیائی دھماکہ نہیں تھا۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر دنیا نیوکلیائی مواد کو ختم نہیں کرتی تو پھر دہشت گرد اسے بڑے شہروں پر حملوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس تو کوئی علاقائی حد بندی نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں جوابی حملے کی دھمکی دی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ عام لوگوں میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔ نہ ہی انہیں میزائلوں سے بچاؤ کے کسی نظام سے روکا جا سکتا ہے۔ ہتھیار تو بندرگاہوں پر پہنچنے والی ہزاروں کھیپوں میں سے کسی کے ذریعے بھی کسی ملک میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس خطرناک صورتحال کا تقاضا ہے کہ نیوکلیائی ہتھیار اور نیوکلیائی مواد دونوں سے ہر ممکن جلد چھٹکارا پا لیا جائے۔

ہمیں مان لینا چاہیے کہ نیوکلیائی ڈیٹرنس ایک خطرناک مغالطہ ہے اور ان پر مبنی نظام خطرناک غلطی۔ اگر نیوکلیائی ہتھیاروں کی حامل بڑی طاقتیں اپنی غلطی مان کر یہ ہتھیار ختم کر دیں تو انڈیا، پاکستان، کوریا اور ایران جیسے ممالک بھی ان میں دلچسپی کھو بیٹھیں گے جہاں انہیں قومی فخر اور جدت کی علامت خیال کیا جا رہا ہے۔

MashalBooks.org

7

جنگ کی قیمت

براہِ راست و بالواسطہ اقتصادی قیمت

جنگ کی براہِ راست اور بالواسطہ قیمت اتنی زیادہ ہے کہ فہم و فراست سے کم و بیش بالا ہو جاتی ہے۔ عالمی سطح پر ہی جنگ کا ادارہ ایسا غالب ہے کہ ٹیکس کی رقم تعمیری اور پر امن مقاصد کے لیے استعمال نہیں ہو پاتی۔ سرد جنگ ختم ہونے کے باوجود دنیا آج بھی اسلحہ بندی پر سالانہ ایک ٹریلین ڈالر خرچ کرتی ہے۔ رقم کا یہ سیلاب تعلیم کی ترقی، غذائی قلت سے نجات زیریں ڈھانچہ کی تعمیر اور صحت عامہ کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کیا جا سکتا تھا۔

اپنے ملیریا کے خلاف پروگرام کو مطلوبہ پیمانے پر چلانے کے لیے (WHO) کو رقم کی کمی درپیش ہے۔ حالانکہ فوجی اداروں پر فقط ایک دن میں خرچ ہونے والی رقم اس پروگرام کو چلانے کے لیے کافی زیادہ ہے۔ ڈبلیو ایچ او نے چیچک کو عالمی پیمانے پر ختم کرنے کے لیے مہم چلائی تھی۔ اس کا کل خرچ عالمی سطح پر ہتھیاروں کے پانچ گھنٹے کے برابر ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ دنیا میں ہر لاکھ کی آبادی کے لیے صرف 85 ڈاکٹر اور 556 فوجی ہیں۔ ہر سپاہی پر سالانہ بیس ہزار امریکی ڈالر کا خرچ اٹھتا ہے جبکہ سکول کے ایک بچے کی تعلیم پر اوسطاً 380 ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اگر صرف تین ہفتے کا عالمی فوجی خرچ بچا لیا

MashalBooks.org

جائے تو پوری دنیا کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا جاسکتا ہے اور یوں نصف سے زیادہ انسانی علالتوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

ابھی حال ہی میں سابقہ سوویت یونین اور ایشیا کے بعض ممالک میں تپ دق کی ایک نئی شکل پھیلی ہے جو موجود دواؤں کی مزاحمت کرتی ہے۔ تپ دق کی اس نئی شکل سے نمٹنے کے لیے ڈبلیو ایچ او کو 500 ملین ڈالر کی ضرورت ہے جو دنیا بھر میں صرف چار گھنٹوں میں فوج پر خرچ کر دیئے جاتے ہیں۔

آج ہماری دنیا میں اندازاً دس ملین بچے ہر سال خوراک کی قلت یا اس کے سبب پیدا ہونے والی بیماریوں سے مر جاتے ہیں۔ ناکافی تعلیمی سہولتوں کے سبب انسانی صلاحیتوں کا زیاں کہیں زیادہ ہے۔ سب سے کم ترقی یافتہ 25 ممالک میں ناخواندگی کی شرح 80 فیصد ہے اور 800 ملین لوگ ناخواندہ ہیں جبکہ دوسری طرف ہر 60 سیکنڈ میں اسلحہ بندی پر دو ملین ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں۔

صاف نظر آتا ہے کہ اگر جنگ کے ادارے پر خرچ ہونے والی یہ ناقابل یقین رقم تعمیر میں استعمال ہونے لگے تو انسانیت کو درپیش زیادہ تر مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ آج کی دنیا میں تعمیر و ترقی سے بیس گنا رقم تخریب و تباہی کی پیامبر جنگ پر خرچ ہو جاتے ہیں۔

1998ء میں بروکنگز (Brookings) انسٹی ٹیوٹ کے تیار کردہ ایک تخمینے کے مطابق ریاستہائے متحدہ نے نیوکلیائی ہتھیاروں پر 1940ء سے 1998ء تک 5.7 ٹریلین ڈالر خرچ کئے۔ یہ رپورٹ چار سالہ مطالعہ اور تحقیق کے نتیجے میں مرتب کی گئی۔ رپورٹ مرتب کرنے والوں نے نیوکلیائی تحقیق، پیش رفت، کمانڈ اینڈ کنٹرول اور دفاع میں ان کی ترویج کے حوالے سے ہونے والے اخراجات کا تخمینہ لگایا تھا۔ اگر یہ ادارہ مستقبل کے صفائی ستھرائی اور قومی قرض پر منافع کی شرح کے آئندہ اضافے کو بھی پیشِ نظر رکھتا تو اعداد و شمار کہیں زیادہ ہو جاتے۔

بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین سٹیفن آئی شوارٹز کا بیان تھا کہ نیوکلیائی ہتھیار اس ایقان پر بنائے اور جمع کئے گئے تھے کہ یہ روایتی ہتھیاروں کے مقابلے میں سستے پڑتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر حقیقی اخراجات معلوم ہوتے تو اس منطق کی صحت پر ضرور سوال اٹھتے۔ اگرچہ الگ الگ پروگراموں کی لاگت پر وقتاً فوقتاً بات ہوتی رہی۔ لیکن سالانہ یا مجموعی

اخراجات کبھی دستاویزی صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آپائے اور نہ ہی ان پر حقیقی جمہوری انداز میں بات ہوسکی۔

غالباً سوویت یونین میں بھی نیوکلیائی ہتھیاروں پر اسی طرح کے اخراجات اٹھے ہوں گے۔ طرفین میں سے دونوں نے اپنے اپنے پروگراموں کو ضروری خیال کیا ہوگا کہ اسے دوسرے کا مقابلہ کرنا ہے۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہی رقم تعمیری انداز میں استعمال ہوتی تو کیا ہوتا۔

طبی ونفسیاتی نتائج وعواقب

پہلے زمانوں میں جنگ کے اثرات کو میدان تک محدود رکھنا ممکن تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں جنگ کا شکار ہونے والوں میں شہریوں اور بالخصوص بچوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ مثال کے طور پر کوئنسی رائیٹ (Quincy Wright) شماریات سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران 26 ملین فوجی ہلاک ہوئے لیکن شہریوں کا زیاں کہیں زیادہ تھا۔ یعنی کوئی 64 ملین شہری مر گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اقوام متحدہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی ڈیڑھ سو مسلح تصادم ہوئے اور اگر خانہ جنگیوں کو بھی ملایا جائے تو کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں اوسطاً بارہ جنگیں نہ ہو رہی ہوں۔ انڈوچائنا تنازعات میں شہری جانوں کے ایتلاف کی شرح اسی سے نوے فیصد تھی جبکہ لبنان کی خانہ جنگی میں بعض ذرائع کے مطابق شہری ہلاکتیں ستانوے فیصد سے بھی زیادہ تھیں۔

شہری ہلاکتوں کی اکثریت غذا کی قلت جیسی بیماری کے سبب ہوتی ہے جن سے معمول کے حالات میں نپٹا جاسکتا ہے۔ جنگ کے دوران سماجی انتشار، خوراک کی فراہمی کے معمول میں تعطل اور پینے کے پانی اور ادویات کی فراہمی میں رکاوٹ جیسے اسباب قحط اور وباؤں کو جنم دیتے ہیں۔

روایتی ہتھیاروں سے ہونے والی جنگ کی برائیاں اپنی جگہ لیکن ایسی تباہ کن نیوکلیائی جنگ کے خدشات بھی موجود ہیں کہ تمام انسانیت مٹ جائے گی۔ پہلے بات ہو چکی ہے کہ اس وقت دنیا میں 30 ہزار نیوکلیائی بم موجود ہیں۔ موجود بموں کے دھماکے کی قوت

MashalBooks.org

ہیروشیما پر گرائے گئے بم سے ایک ملین گنا زیادہ ہے۔

ان بموں کی ابتلا کو بیان کرنا مشکل ہے۔ ہیروشیما کے سانحہ کو محض ایک ملین سے ضرب دینا کافی نہ رہے گا۔ ہمارے موجود ہتھیاروں کی تباہ کاری کیفئی اور قدری ہر اعتبار سے اور طرح کی شے ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر آج کوئی نیوکلیائی جنگ ہوتی ہے تو ہماری تہذیب، جینیاتی پول اور ماحولیات کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

تھرمو نیوکلیائی ہتھیاروں میں مرکزی حصہ یورینیئم۔ 235 یا پلوٹونیم۔ 239 پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس حصے میں ہونے والا انشقاق اگلی تہ میں فیوژن ری ایکشن کو جنم دیتا ہے۔ بعض ہتھیاروں میں اس بیرونی تہ کے باہر عام یورینیئم کی ایک اور تہ رکھی جاتی ہے جو فیوژن میں پیدا ہونے والے انتہائی حالات میں ایک بار پھر انشقاق کے عمل سے گزر سکتی ہے۔ یوں فشن سے فیوژن اور فیوژن سے دوبارہ فشن پیدا ہوتا ہے اور تقریباً لا محدود قوت کا ایک بم وجود میں آتا ہے۔

سویڈن کی رائل سوسائٹی نے تھرمو نیوکلیئر جنگ کے نتائج وعواقب کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی پینل تشکیل دیا تھا۔ اس مطالعہ کے نتائج ایک جریدے ''Ambio'' نے 1983ء کے خصوصی شمارے میں شائع کئے۔ ان نتائج کے مطابق اگر فریقین ایک دوسرے پر 5700 میگا ٹن کے نیوکلیائی ہتھیار برساتے ہیں تو شمالی نصف کرے کے شہری علاقوں میں ساڑھے سات سو ملین لوگ فوراً مر جائیں گے جبکہ 300 ملین شدید زخمی ہوں گے۔

برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کے ذیلی ادارے بورڈ آف سائنس اینڈ ایجوکیشن نے نیوکلیائی جنگ کے طبی اثرات پر ایک رپورٹ "The Medical Consequence of Nuclear Weapon" 1983ء میں تیار کی۔ اس رپورٹ کے مطابق ''اگر سینٹ پال کیتھڈرل پر ایک میگا ٹن کا دھماکہ ہوتا ہے تو صرف پہلے ہلے میں سولہ لاکھ افراد زخمی ہوں گے۔ اگر آبادی کا ایک فیصد بھی حملے کے وقت کھلے میں ہو تو ان میں سے پچیس ہزار بری طرح جل جائیں گے۔ اور اگر آبادی کا 25 فیصد گھروں سے باہر ہوا تو ان کی تعداد ساڑھے چھ لاکھ ہو جائے گی۔ اس کے بعد جا بجا بھڑکنے والی آگ میں زخمی ہونے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ واضح نظر آتا ہے کہ صرف اس ایک بم کے چلنے سے زخمی

MashalBooks.org

ہونے والے افراد کی تعداد اس ملک میں دستیاب طبی سہولتوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔'' تباہی کا یہ تخمینہ پڑھتے ہوئے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ فقط ایک میگا ٹن کے بم کا حال ہے جبکہ نیوکلیائی جنگ ہو جانے کی صورت میں برطانیہ پر غالباً 200 تا 600 میگا ٹن کے بم برس سکتے ہیں۔ خطرناک آبلے اور دھماکوں سے پیدا ہونے والی چوٹوں کے ساتھ اس آبادی کو گرتی عمارتوں کا سامنا ہوگا۔ اس پر براہ راست نیوکلیائی شعاعیں پڑیں گی اور تابکار ذرات خوراک میں دھنس جائیں گے۔ تابکاری کو عام طور پر ریڈز (Rads) میں ماپا جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص 600 ریڈز کی شعاع کاری برداشت نہیں کر سکتا۔ تقریباً نصف لوگ 450 ریڈز پر مر جاتے ہیں۔ پچاس سے سو ریڈز انسانی مدافعتی نظام کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ 1954ء میں بکنی اٹال (Bikiny Atoll) پر پندرہ میگا ٹن کا بم چلایا گیا۔ اس کے چھیانوے گھنٹے کے بعد ہوا میں 190 کلو میٹر تک تین ہزار ریڈز کی شعاع موجود تھی جبکہ 360 کلو میٹر تک 300 ریڈز کی پیائش کی گئی۔

ریڈی ایشن سے شدید متاثرہ شخص پہلے ہفتے میں متلی، قے، بخار، بے ہوشی، پیچش، گلے کی بندش وغیرہ کا شکار ہوتا ہے اور ایک دو ہفتے کے اندر موت واقع ہو جاتی ہے۔

نیوکلیائی حادثے کا تصور کرنے کے لیے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا بیان معاون ثابت ہو سکتا ہے جو ہیروشیما پر بم گرنے کی جگہ سے اڑھائی کلو میٹر کے فاصلے پر موجود تھا:

''جو کچھ میں نے دیکھا میرے دل پر نقش ہو گیا۔ ایک پارک لاشوں سے پٹا پڑا تھا اور مردہ اجسام دفنائے جانے کے منتظر تھے۔ لوگ انتہائی زخمی حالت میں بھاگتے میری طرف آ رہے تھے۔ نوعمر لڑکیوں کے نہ صرف کپڑے پھٹ گئے تھے بلکہ ان کی جلد بھی اتر گئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ سب جہنم کا منظر ہے جس کا حال میں نے کہیں پڑھا تھا۔ میں نے ایسی کوئی چیز پہلے کہیں نہ دیکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر جہنم کہیں موجود ہے تو اسی طرح کا ہوگا۔''

نیوکلیائی ہتھیاروں کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہوش و حواس میں کوئی سیاسی رہنما انہیں استعمال نہیں کرے گا۔ لیکن ڈیٹرنس کے تصور میں حادثاً یا غلط فہمی کے سبب ہونے والی جنگ کے امکان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ نیوکلیائی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے امکان بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ان ہتھیاروں پر کنٹرول کے نظام میں کمپیوٹروں پر انحصار بھی اس خطرے کو جنم دے رہا ہے۔

MashalBooks.org

نیوکلیائی توانائی کے پلانٹوں میں ہونے والے حالیہ حادثوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے حادثے انسانی یا تکنیکی غلطی سے ہو سکتے ہیں۔ اور ہم جن نظاموں کو مامون سمجھتے ہیں وہ بھی زیادہ محفوظ نہیں۔ ہمیں مسئلے کے زمانی پیمانے کو بھی ذہن میں رکھنا ہو گا۔ انسانیت کے مستقبل کی یقین دہانی کے لیے ہمیں مستقبل بعید میں بھی نیوکلیائی ابتلا سے بچنا ہے۔ بطور تہذیب ہماری بقا صرف اسی میں ہے کہ نیوکلیائی ہتھیار اور بالآخر جنگ کا ادارہ دونوں ختم کر دیئے جائیں۔

ماہرین بالعموم متفق ہیں کہ بھرپور نیوکلیائی جنگ کی صورت میں متحارب اقوام کے ساتھ ساتھ غیر جانبدار ممالک بھی متاثر ہوں گے۔ اقوام متحدہ کے ایک سابقہ سیکرٹری جنرل ہاویئے پیریز ڈی کویار (Javier Perez de Cuellar) اس بات کو یوں بیان کرتا ہے:

''میرا خیال ہے کہ بڑی نیوکلیائی قوتوں سے یہ پوچھنا عین جائز ہے کہ انہیں انسانیت کے مقدر کا فیصلہ کرنے کا کیا حق ہے؟ سکینڈے نیویا سے لاطینی امریکہ اور یورپ سے افریقہ اور مشرق بعید تک ہر مرد وزن کی قسمت ان کے عملوں سے متاثر ہے۔ کسی کو توقع نہیں کہ وہ اس نازک توازن پر قائم سیارے میں نیوکلیائی جنگ کے تباہ کن نتائج وعواقب سے بچ نکلے گا۔''

''کسی بھی طرح کے نظریاتی اختلافات کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ انسانیت کے مستقبل کو داؤ پر لگائے۔ کوئی اور چیز نہیں بلکہ انسان کی بقا خطرے میں ہے۔ ہمارے آج کے فیصلے صرف حال کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھی خطرے میں ڈالتے ہیں۔ ہم نہ صرف اس وقت موجود لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں بلکہ ان پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے بڑی غفلت کیا ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری پچھلی نسلوں کی حیات بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ آج ہم میں یہ قوت موجود ہے کہ اپنے گھنٹوں یا منٹوں کے تنازعہ میں تہذیب کے پورے کام کو ملیامیٹ کر دیں اور ساتھ ہی انسانیت کے سارے ورثے کو بھی۔''

''اس نیوکلیائی عہد میں جنگ اور امن کے فیصلے محض عسکری منصوبہ سازوں بلکہ حکومتوں پر بھی نہیں چھوڑے جا سکتے۔ اس طرح کے فیصلے آج ہر مرد وزن کے حصے میں آتے

MashalBooks.org

ہیں۔ چنانچہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ باہمی بداعتمادی کے چکر کو توڑیں اور انسانیت کے لیے ضروری امن کی پکار پر لبیک کہیں۔''

1985ء میں امن کا نوبل پرائز نیوکلیائی جنگ کے خلاف کام کرنے والی ڈاکٹروں کی تنظیم "International Physicians for the Prevention of Nuclear War" کو دیا گیا۔ یہ تنظیم 1980ء میں چھ ڈاکٹروں نے قائم کی جن میں سے تین کا تعلق سوویت یونین اور تین کا ریاستہائے متحدہ سے تھا۔ آج دنیا بھر کے معالجین کی ایک بڑی تعداد اس تنظیم کی رکن ہے۔ تنظیم کے ایک بانی رکن ہارورڈ سکول آف پبلک ہیلتھ کے پروفیسر برنارڈ لاون (Bernard Lowen) نے کہا:

''نوع انسان کو کبھی بھی نیوکلیائی جنگ سے زیادہ بڑے خطرے کا سامنا نہیں رہا۔ اس سے پہلے انسان کے پاس کبھی اپنے سیارے کو ناقابل رہائش بنانے کے ایسے تباہ کن ذرائع موجود نہیں تھے۔ نیوکلیائی جنگ کی صورت میں جدید میڈیسن برائے نام مداوا نہیں کر سکتی۔''

ہم اس کرہ ارض پر محض عبوری حیثیت میں آتے ہیں۔ یہ ہماری ملکیت نہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ان نسلوں کے مقدر کا فیصلہ کریں جنہیں ابھی پیدا ہونا ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ انسانیت کے ماضی کا صفایا کریں یا اس کے مستقبل کی لو مدھم کر دیں۔ سماجی نظاموں کو دوام حاصل نہیں۔ اس طرح کے تسلسل کا دعویٰ فقط حیات کر سکتی ہے۔ مقدس یہی تسلسل ہے۔''

بچوں پر جنگ کے اثرات

یونیسف کے اعداد و شمار کے مطابق حالیہ جنگوں میں ہلاک ہونے والوں میں سے نوے فیصد کا تعلق شہریوں سے تھا اور ان میں پچاس فیصد بچے تھے۔ ادارے کا تخمینہ ہے کہ حالیہ برسوں میں ہونے والے تنازعات میں بیس ملین بچے بے گھر ہوئے۔ یہ یا تو اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے یا پھر اپنے ہی ملک میں گھر سے بے گھر ہوئے۔

گذشتہ عشرے میں ہونے والے مسلح تصادموں میں دو ملین بچے مارے گئے اور دو ملین شدید زخمی ہوئے یا مستقلاً اپاہج ہو گئے جبکہ ایک ملین بچے اپنے والدین کھو بیٹھے یا اپنے

MashalBooks.org

اہل خانہ سے بچھڑ گئے۔ یونیسف کا اندازہ ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں کوئی تیس جگہ مسلح تصادموں میں تین لاکھ بچوں کو جبراً شامل رکھا گیا ہے جن میں سے اکثریت کو جبری بھرتی کے تحت ان میں ملوث کیا گیا ہے۔

جو بچے ان تصادموں کے دوران زخمی نہیں ہوتے اکثر تکلیف دہ نفسیاتی مسائل سے دو چار ہوجاتے ہیں۔ جب ان بچوں کے والدین مار دیئے جاتے ہیں، اہل خانہ عقوبت کا شکار ہوتے ہیں، عام زندگی بکھر جاتی ہے یا لڑائی سے عائلی زندگی متاثر ہوتی ہے تو یہ بچے فاقوں اور مستقبل کے متعلق بے یقینی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

پناہ گزیں

ہیومن رائٹس واچ کے تخمینے کے مطابق 2001ء میں دنیا بھر میں کوئی پندرہ ملین پناہ گزیں موجود تھے جنہیں جنگ، خانہ جنگی اور سیاسی تصادموں کے سبب یا بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے باعث اپنے ممالک سے نکلنا پڑا۔ علاوہ ازیں کوئی 22 ملین لوگ ایسے تھے جو اپنے ملک میں بے گھر ہوئے۔

2001ء میں کل پناہ گزینوں کا 78 فیصد دس علاقوں سے وابستہ تھا: افغانستان، انگولا، برما، برونڈی، کانگو، کنشا سا، اریٹریا، عراق، فلسطینی علاقہ جات، صومالیہ اور سوڈان۔ پناہ گزینوں کا ایک چوتھائی فلسطینیوں پر مشتمل ہے جو دنیا کی قدیم ترین اور سب سے بڑی پناہ گزیں آبادی ہے۔ پناہ گزینوں میں سے 45 فیصد نے ایشیا میں، 30 فیصد نے افریقہ، 19 فیصد نے یورپ اور 5 فیصد نے امریکہ میں پناہ لے رکھی ہے۔

انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے (Universal Declaration of Human Rights) کے آرٹیکل 14 کے تحت بین الاقوامی سرحد پار کرنے والے پناہ گزینوں کو دیگر ممالک میں تعذیب وعقوبت سے پناہ مانگنے کا حق حاصل ہے۔

1950ء میں آرٹیکل 14 کا اطلاق کرنے کے لیے پناہ گزینوں کے ہائی کمشنر کا دفتر قائم کیا گیا اور 1951ء میں اقوام متحدہ نے پناہ گزینوں کی حیثیت (Status) کا کنونشن منظور کیا۔ اس پر 140 ممالک دستخط کر چکے ہیں اور عمل کرنے کے پابند ہیں۔ تاہم صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک نے حالیہ برسوں میں پناہ گزینوں کے حوالے سے نہایت

MashalBooks.org

معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ نہ صرف انہیں سماجی اور قنصادی حقوق دینے سے انکار کیا جاتا ہے بلکہ داروگیر کے طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں اور بعض اوقات انہیں واپس ان ملکوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

اپنے ملکوں میں بے گھر ہو جانے والوں کی حالت بین الاقوامی سرحدیں عبور کرنے والوں سے بھی بری ہے۔ بین الاقوامی برادری نہ صرف ان کی ابتلا سے لاتعلق رہتی ہے بلکہ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے گریز کرتی ہے۔ اس حوالے سے اقوام متحدہ کا اپنا چارٹر ہی اندرونی تضاد کا شکار ہے۔ یہ ایک طرف تو دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے منع کرتا ہے جبکہ دوسری طرف اپنے انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے کے تحت لوگوں کو ہر کہیں داروگیر سے آزادی دیتا ہے۔

اندرونی طور پر بے گھر ہونے اور نسل کشی کی تازہ ترین مثال سوڈان میں سامنے آئی ہے جہاں حکومت اور عربی النسل نیم فوجی دستے شہریوں کے منظم قتل عام اور دیہاتوں اور قصبوں کے جلانے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اکثریتی حکومت اپنے اقلیتی حریفوں کا جینا حرام کئے ہوئے ہے۔ کم وبیش ایک بلین لوگوں کو بے گھر کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے بہت سے بھاگ کر سوڈان اور چاڈ کے درمیان واقع علاقوں میں پہنچ گئے ہیں۔ چاڈ کی حکومت نے بھی انہیں اپنے ملک میں اندر تک جانے کی اجازت نہیں دی اور ان کی موجودہ پناہ گاہیں خطرے سے دوچار رہتی ہیں۔

زیریں ڈھانچہ کو پہنچنے والا نقصان

زیادہ تر انشورنس کمپنیوں نے اپنی شقیں انتہائی باریک حرفوں میں چھاپ رکھی ہیں اور جنگ کی صورت میں ہونے والے نقصانات پر ادائیگیوں سے بچ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ بہت سیدھی ہے۔ جنگ سے ہونے والے نقصان اتنے زیادہ ہیں کہ انشورنس کمپنیاں ادائیگیاں کرنے لگیں تو بہت جلد دیوالیہ ہو جائیں۔

اوپر ذکر آیا ہے کہ دنیا جنگ کی تیاریوں پر سالانہ کوئی ایک ٹریلین ڈالر خرچ کرتی ہے۔ زیریں ڈھانچہ کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لیے بھی اتنی ہی بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات یہ نقصان انجانے میں ہو جاتا ہے لیکن اکثر جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

جنگ عظیم دوم کے دوران طرفین نے زیادہ تر ہوائی حملے حریف کے صنعتی زیریں ڈھانچہ کو تباہ کرنے کے لیے کیے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد دشمن کو مزید اسلحہ بنانے سے روکنا تھا۔ لیکن 1990ء کی جنگ خلیج میں زیریں ڈھانچہ کی تباہی کے لیے ہونے والے حملے ناقابل فہم تھے حالانکہ سب کو علم تھا کہ جنگ بہت مختصر ہوگی۔ بمباری میں بجلی پیدا کرنے کے پلانٹ اور پانی صاف کرنے کی سہولتوں کو منصوبے کے تحت تباہ کیا گیا۔ چونکہ جنگ زیریں ڈھانچہ پر تباہ کن اثرات مرتب کرتی ہے چنانچہ اسے ترقی کے متضاد سمجھا جا سکتا ہے اور جنگ غربت کی افزائش کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

ماحولیاتی تباہی

بیسویں صدی کے سامان جنگ نے فقط 175 ملین انسانوں کی جان ہی نہیں لی بلکہ ماحولیات کو تاریخ کا سب سے عظیم نقصان بھی پہنچایا۔ یہ نقصان امن کے زمانے میں بھی جاری رہتا ہے۔ ورمونٹ یونیورسٹی کے جغرافیہ داں جونی سیگر (Johny Seager) نے نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا میں کسی بھی جگہ فوج کی موجودگی کا مطلب لازمی طور پر ماحول کی تباہی ہے۔

جدید سامان جنگ ماحول کو ناقابل بیان نقصان پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ ویت نام کے دوران استعمال ہونے والی نبات کش ادویات نے شمالی اور مغربی سائیگون (Saigon) میں 6.2 بلین بورڈ فیٹ اعلیٰ درجہ کی لکڑی کے جنگلات تباہ کر دیئے۔ نباتات کش مادہ ایجنٹ اورنج استعمال کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو زمین کبھی انتہائی زرخیز ہوا کرتی تھی آنے والے کئی سالوں کے لیے بانجھ ہو کر رہ گئی۔* دنیا میں دیگر جگہوں پر بھی قیمتی زرعی زمین بارودی سرنگوں اور کلسٹر بموں کے باعث ناقابل استعمال ہو گئی ہے۔

1990ء کی خلیجی جنگ کے دوران 150 ملین بیرل تیل بہ گیا۔ اس جنگ میں یورینیئم کے بے شمار بم فائر کئے گئے جس کی گرد اکثر کینسر کا سبب بنتی ہے اور یہ عشروں تک عراق کے ماحول میں موجود رہے گی۔

نیوکلیائی بموں کی آزمائش سے پیدا ہونے والی تابکاری نے عالمی ماحول کو آلودہ

* ایجنٹ اورنج نامی کیمیائی مادے نے ویت نامی آبادی اور وہاں لڑنے والے غیر ملکی فوجیوں میں کینسر، پیدائشی نقائص اور دیگر خطرناک بیماریاں پیدا کیں۔

MashalBooks.org

کر دیا ہے۔ نہ صرف کینسر کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے بلکہ پیدائشی نقائص میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ زیادہ تر نیوکلیائی آزمائشی دھماکے ایسے علاقوں میں کئے گئے جہاں کے اصل باشندے اس طرح کی حرکتوں کے ساتھ کسی طور پر متعلق نہیں ہیں۔

ہماری اپنی نوع کے ساتھ ساتھ نیوکلیائی جنگ کے خطرے نے کرۂ ارض کی ماحولیات کو بھی خطرے سے دو چار کر رکھا ہے۔ مشرق و مغرب کے بہت سے ماہرین نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے استعمال کی صورت میں کرۂ ارض کو در پیش خطرات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے گا تو انتہائی تیز رفتار ہواؤں کے ساتھ پھیلتے آگ کے طوفان پیدا ہوں گے اور متاثرہ اقوام کے جنگلات جل جائیں گے۔ پیدا ہونے والا دھواں اور گرد کرۂ ہوائی میں اوپر چڑھے گا اور مہینوں تک دھوپ نیچے نہیں آئے گی۔ پہلے پہل یہ عمل جنوبی نصف کرے میں ہو گا لیکن پھر شمالی نصف کرہ بھی اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ کئی جگہوں پر درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے چلا جائے گا اور کرۂ ارض کے زیادہ تر پودے مر جائیں گے۔ یوں انسان اور دیگر جانور فاقوں سے مریں گے۔

نیوکلیائی سرمائی اثر سب سے پہلے 1971ء میں دریافت ہوا جب میرینر۔ 9 خلائی جہاز کو مریخ پر بھیجا گیا۔ یہ جہاز مریخ پر پہنچا تو وہاں گرد کا ایک بہت بڑا طوفان موجود تھا۔ خود کار پیمائشوں سے پتہ چلا کہ کرۂ ہوائی کے بالائی حصے اور مریخ کی سطح پر کے درجہ حرارت میں بہت بڑا فرق موجود ہے۔ ان پیمائشوں سے سائنس دانوں کو سیاروی کرۂ ہوائی میں موجود گرد اور دیگر آلودگیوں کے سبب سطح پر کے درجہ حرارت پر پڑنے والے اثرات کی پیشگوئی میں خاصی مدد ملی۔

مریخ کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے تجربے کو استعمال کرتے ہوئے ایکرمین، پولیک اور کارل سیگاں نے زمینی کرۂ ہوائی میں موجود دھوئیں اور ذرّات کے اثرات کا مطالعہ کمپیوٹر کی مدد سے کیا۔ اِس ماڈل کو بعض اوقات مصنفوں کے ناموں کے پہلے حروف پر ٹی ٹی اے پی ایس (TTAPS) کہا جاتا ہے۔

اپریل 1983ء میں کیمبرج، میسا چیوسٹس، میں ہونے والی ایک خصوصی میٹنگ میں سو سے زیادہ ماہرین نے ٹی ٹی اے پی ایس کے نتائج کی روشنی میں نیوکلیائی سرمائی اثر پر

MashalBooks.org

بات چیت کی۔ ان کے نتائج واشنگٹن ڈی۔سی میں ہونے والے فورم کو پیش کئے گئے۔ اس فورم کا چیئرمین امریکی سینیٹر کینیڈی تھا۔ ماہرین اخذ ہونے والے مندرجہ ذیل نتائج پر متفق پائے گئے۔

اگر زمین کی سطح کے نزدیک نیوکلیائی ہتھیاروں کے دھماکے ہوتے ہیں تو گرد وغبار کی بڑی مقدار کرۂ ہوائی کی بالائی تہوں میں پہنچ جائے گی۔ شہروں، جنگلوں، تیل کے کنوؤں اور ریفائنریوں میں آگ کے طوفان اٹھیں گے۔ بلندی پر موجود گرد اور نیچے موجود دھوئیں کا ملاپ ہوگا تو سورج کی روشنی زمین کی سطح پر نہیں پہنچ پائے گی۔ شمالی اور عرض بلدوں پر موجودہ دھوپ کا صرف ایک فیصد زمین تک پہنچے گا اور یہ صورتحال کئی ماہ تک برقرار رہے گی۔ نتیجتاً کرہ ہوائی کی بالائی تہوں کا درجہ حرارت 100° سنٹی گریڈ ہو جائے گا۔ خشکی کے براعظمی ٹکڑوں پر خشک سالی ہو گی۔ نتیجتاً کرۂ ہوائی کا گرد وغبار صاف نہ ہو پائے گا اور نیوکلیائی سرمائی اثر طویل تر ہوتا چلا جائے گا۔*

دھوپ کی کمی، انتہائی ٹھنڈک اور خشک سالی کے سبب شمالی نصف کرے کے جنگلات مر جائیں گے۔ اگرچہ جنوبی نصف کرے میں پیدا ہونے والی ٹھنڈک بہت زیادہ نہیں ہو گی لیکن استوائی جنگلات کا ایک بڑا حصہ ختم ہو جائے گا اور کرہ ارض پر آکسیجن کی فراہمی کا چکر متاثر ہوگا۔ آکسیجن خطرناک حد تک کم ہو جائے گی جبکہ آگ کے طوفانوں کے باعث کاربن ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن کے آکسائیڈ کا تناسب بڑھ جائے گا۔ نائٹروجن کے آکسائیڈز رفتہ رفتہ بالائی فضا میں پہنچیں گے اور اوزون کی تہ کو تباہ کر دیں گے۔ کئی ماہ کے بعد بالآخر جب دھوپ زمین کی سطح پر آنے لگے گی تو اس میں بالائے بنفشئی فریکوئنسی کی زیادتی ہو گی جو عام حالات میں اوزون کو روک لیتی ہے۔ یہ روشنی بجائے خود حیات کے لیے خطرہ ہے۔ اس امر کی کوئی ضمانت موجود نہیں کہ یوں متاثر ہونے کے بعد زمین کا کرۂ ہوائی اپنا معمول کا توازن حاصل کر پائے گا یا نہیں۔ اگر نیوکلیائی جنگ کا پیمانہ نیوکلیائی سرما کے خط فاصل سے نیچے بھی رہتا ہے تو اس کے اثرات انسانی زندگی کے لیے نہایت تباہ کن ہوں گے۔ سٹینفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال اہرلک کا کہنا ہے:

''ایک چھوٹی جنگ سے اٹھنے والا گرد وغبار اور لگنے والی آگ بھی درجہ حرارت

* بعض حالیہ مطالعات میں کم خطرات کی پیشگوئی کی گئی ہے۔

MashalBooks.org

میں بآسانی 7° تا 8° کی کمی کر دے گی۔ اس کے نتیجے میں شمالی نصف کرے میں اناج کی پیداوار ختم ہو جائے گی۔ فوری اثرات سے قطع نظر یہی ایک شے ہی نوع انساں کے لیے کم پریشان کن نہیں۔ چنانچہ ایک خاص خط فاصل سے کم تر نیوکلیائی جنگ بھی انسانی بقا کے حوالے سے خطرناک ہوگی۔''

MashalBooks.org

8

جنگ کا کاروبار

ہتھیاروں کی صنعت کی سیاسی اور اقتصادی قوت اور عسکری مقتدرہ

چونکہ اسلحہ بندی پر سالانہ کوئی ایک ٹریلین ڈالر خرچ ہوتے ہیں چنانچہ بہت سے لوگوں کے ذرائع روز گار جنگ سے وابستہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جنگ کو معاشرتی،سیاسی واقتصادی ادارہ کہنا درست ہے۔انہی وجوہات کی بنا پر جنگ موجود ہے۔حالانکہ ہر کسی کو خبر ہے کہ یہ انسانیت کے لیے کسی درجہ تباہ کن ہے۔ہم جانتے ہیں کہ جنگ پاگل پن ہے لیکن یہ موجود ہے۔ہمیں خبر ہے کہ یہ ہماری نوع کی بقا کے لیے خطرہ ہے لیکن یہ موجود ہے۔یہ مورخین، اخباری مدیروں اور ٹی وی کے پیش کاروں کے رویے میں موجود ہے۔جنگ سیاست دانوں کی مہموں کی مالیات میں موجود ہے اور یہ اسلحہ سازوں کی مالیاتی طاقت میں موجود ہے۔جنگ بحری جہازوں کے بیڑوں، بمباروں، ٹینکوں، نیوکلیائی میزائلوں اور دیگر قیمتی سامان جنگ میں موجود ہے۔

اپنے ابتدائی خطاب میں امریکی صدر ڈی آئزن ہاور نے امریکی قوم کو قوت کی اس زیادتی سے پیدا ہونے والے خطرات سے خبردار کیا تھا جو عسکری، صنعتی ملاپ کے ذریعے دوسری جنگ عظیم کے دوران حاصل ہوگئی تھی: ''ہمیں ایک بہت بڑی اسلحہ بندی کی صنعت پیدا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ایک زبردست عسکری مقتدرہ اور اسلحہ کی بہت بڑی صنعت

MashalBooks.org

امریکیوں کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ اقتصادی، سیاسی اور حتیٰ کہ روحانی اعتبار سے بھی ایک کلیتی اثر ہر شہر، ہر ریاستی ادارے اور وفاقی حکومت کے ہر دفتر میں محسوس کیا جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان خطرناک مضمرات کو سمجھیں۔ ہماری محنت، وسائل اور روزگار سب اس میں ملوث ہیں اور ہماری معاشرت کی ساخت بھی اس میں ملوث ہوگئی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ عسکری صنعتی کمپلیکس کے اس اثر سے خبردار رہیں۔ قوت کے بے جا ہوجانے کا خطرہ موجود ہے اور موجود رہے گا۔ ہمیں چاہیے کہ اس ملاپ کو اپنے جمہوری عمل پر اثر انداز نہ ہونے دیں۔ ہمیں چاہیے کہ کسی بھی شے کو پوری پرکھ اور سوچ و بچار کے بغیر وقوع پذیر نہ ہونے دیں۔''

آئزن ہاور کے ان الفاظ میں ایک اور امریکی صدر جارج واشنگٹن کے الفاظ کی گونج ملتی ہے جس نے خبردار کیا تھا کہ ایک خاص حد سے بڑھ جانے والی عسکری مقتدرہ اور ادارہ جمہوریت کے لیے اور آزادی کے لیے بھی برا شگون ہے اور بالخصوص ری پبلکن آزادی کے لیے نہایت معاندانہ عمل۔''

عسکری صنعتی کمپلیکس کو دشمنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دشمن نہ ہوں گے تو یہ ادارے مرجھا جائیں گے۔ جنگ عظیم دوم ختم ہوئی تو اس وسیع کمپلیکس کو بحران کا سامنا ہوا۔ ایک نئے دشمن یعنی کمیونزم کی دریافت نے اسے بچا لیا۔ تاہم سرد جنگ ختم ہوئی تو اسے پھر ایک خوف ناک بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ہتھیار ساز کمپنیاں اور تحقیق، حکومت اور ذرائع ابلاغ میں موجود ان کے ساتھی بھی بحران سے دوچار ہوئے۔ لوگوں نے امن کے ثمرات میں حصہ داری مانگی۔ یعنی وہ لوگ سالانہ اسلحہ بندی پر خرچ ہونے والے ایک ٹریلین ڈالر کے تعمیری استعمال کی بات کرنے لگے۔ تاہم عین وقت پر اس عسکری صنعتی کمپلیکس کو ایک بار پھر نیو یارک اور واشنگٹن پر ہونے والے 11 ستمبر کے حملوں نے بچا لیا۔ یہ حملے بجائے خود جنگ نہیں تھے بلکہ انہیں انفرادی فعل سمجھا جا سکتا تھا اور فوج کی بجائے ان کے خلاف پولیس کو سرگرم کرنا چاہیے تھا۔ لیکن بش انتظامیہ اور اس کے ساتھ ساتھ سی این این اور فاکس نیوز چینلز نے دعویٰ کر دیا کہ یہ حالت جنگ ہے اور یہاں جنگ کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے سرد جنگ کی جگہ لے لی۔ ان وقوعوں پر ضرورت سے زیادہ رد عمل کو عسکری صنعتی کمپلیکس کی اپنی ضرورت سمجھا جا سکتا ہے جس کے خلاف آئزن ہاور نے انتباہ کیا تھا۔* حالت جنگ میں دشمن نہ رہتے تو بڑے بڑے اداروں، تنظیموں اور پریشر

گروپوں پر مشتمل یہ مجمع کمزور پڑنے لگتا۔

مشرق وسطیٰ میں تیل اور تنازعات

مشرق وسطیٰ میں موجود تنازعات میں تیل کے کردار پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم رکازی ایندھن کی عالمی صورت حال پر ایک عمومی نظر ڈالیں۔ ٹیبل 8.1 اور 8.2 میں دنیا میں موجود تیل کے ذخائر کی کھپت اور استعمال دکھائے گئے ہیں۔ جبکہ ٹیبل 8.3 میں کوئلے، تیل اور قدرتی گیس کے وہ ذخائر موجود ہیں جنہیں ابھی استعمال نہیں کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر انہیں موجود شرح سے استعمال کیا جائے تو وہ کتنی دیر نکالیں گے۔ اگرچہ اعداد و شمار پر اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان ٹیبلوں کے اصل خصائص شک و شبہ سے بالاتر ہیں اور ان سے کئی اہم نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔

ٹیبل 8.3 سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کوئلے کے عالمی ذخائر خاصے بڑے ہیں لیکن تیل کے ذخائر اتنے محدود ہیں کہ انہیں 1990ء کی شرح پر خرچ کیا جائے تو یہ بمشکل 65 برس نکالیں گے۔** قابل فہم بات ہے کہ اگر تیل کے ذخائر میں کمی ہوتی ہے تو ان کی قیمتیں اتنی بڑھ جائیں گی کہ پیداوار اور کھپت انتہائی کم ہو جائیں گے۔ اسی لیے تیل کے ماہرین مستقبل میں ایسی کوئی تاریخ نہیں دے سکتے جس کے بعد تیل ختم ہو جائے گا۔ لیکن ایک دورانیے کا تعین کیا جاسکتا ہے جس کے بعد تیل کی کھپت اور پیداوار زیادہ سے زیادہ پر پہنچنے کے بعد ذرائع کی کم اور قیمتوں میں اضافے کے سبب کم ہونے لگے گی۔ وسائل میں سے کسی بھی شے کی پیداوار اور کھپت میں آنے والا یہ مقام ہبرٹ پیک (Hubbert Peak) کہلاتا ہے۔ زیادہ تر ماہرین متفق ہیں کہ ایک دو عشروں کے بعد ہبرٹ پیک پہنچ جائے گی۔ اسی لیے سستے پٹرول کا عہد ختم ہونے کو ہے اور ہمیں تیل کی بڑھتی قیمتوں کے حوالے سے خطرناک ممکنہ اقتصادی اور سیاسی اثرات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسی طرح صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے طرز حیات میں بھی ڈرامائی تبدیلیوں کی توقع کی جانی چاہیے۔ موجودہ صدی کے وسط تک پٹرول اتنا مہنگا اور نایاب ہو جائے گا کہ اسے بطور ایندھن برتنا

* بش انتظامیہ کی سیاسی ضروریات بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ وقوعہ سے پہلے یہ حکومت ڈانواڈول تھی۔

** چونکہ 1TWy = 5 Gb چنانچہ 300 TWy = 1500 Gb لہٰذا ٹیبل 8.1 اور ٹیبل 8.3 میں بیان کردہ حقائق باہم منطبق ہیں۔

MashalBooks.org

مشکل ہوجائے گا۔ انسان مجبور ہو جائے گا کہ اسے صرف لبریکیشن اور پلاسٹک، پینٹ، کھاد اور فارماسیوٹیکل میں بطور بنیادی مواد کے استعمال کرنے لگے۔

Table 8.1

Oil production, reserves and resources in 1995 measured in bilions of barrels (Gb). These data were originally published by Oil and Gas Journal and by US Geological Survey. 1 terawatt-year= 5Gb. Only conventional petroleum is shown, i.e. superheavy forms are not inclined. Extraction of superheavy petroleum is very expensive.

Country	Cumulative Production	Reserve	Undiscovered Resources	Reserves and Resources
Saudi Arabia	71.5	261.2	41.0	302.2
Iraq	22.8	112.5	45.0	157.5
Russia	92.6	100.0	68.0	168.0
Iran	42.9	93.0	22.0	115.0
U A Emirates	15.1	98.2	7.0	105.2
Kuwait	27.6	97.5	3.0	100.5
Venezuela	47.3	83.3	17.0	100.3
United States	165.8	50.7	49.0	99.7
Mexico	20.5	50.4	37.0	87.4
Chaina	18.8	24.0	48.0	72.0
Kazakhstan	3.2	17.3	26.0	43.3
Canada	16.1	5.1	33.0	38.1
Libya	19.0	22.8	8.0	30.8
Nigeria	15.5	17.9	9.0	26.9
Norway	6.3	11.3	13.0	24.3

MashalBooks.org

Indonesia	15.2	5.8	10.0	15.8
United Kingdom	12.3	4.6	11.0	15.6
Algeria	9.1	9.2	2.0	11.2
Totals	621.6	1052.3	449.0	1513.8

Table 8.2

Main users of petroleum. (US Energy Information Agency, 2001.)

Country	Yearly use in billions of barrels	Populatin (milions)	Per-capita use in barrels
United Stated	7.17	276	26.0
China	1.82	1262	1.4
Germany	1.03	83	12.4
Japan	0.90	127	7.1
India	0.78	1014	0.8
France	0.74	59	12.5
Mexico	0.71	100	7.1
Canada	0.70	31	22.6
Italy	0.68	58	11.7
United Kingdom	0.63	60	10.5

ٹیبل 8.3 سے پتہ چلتا ہے کہ 1991ء میں رکازی ایندھن کی توانائی کی شرح کوئی 10.2 ٹیٹرا واٹ تھی۔ تب دنیا میں توانائی کے خرچ کی کل شرح کا تخمینہ 13.2 ٹیٹرا واٹ لگایا گیا تھا جبکہ 1890ء میں یہی شرح ایک ٹیٹرا واٹ تھی۔ یوں دیکھا جاسکتا ہے کہ 1991ء میں صرف تین ٹیٹرا واٹ توانائی ایسی تھی جس کا منبع رکازی ایندھن نہیں تھے۔ ان

MashalBooks.org

میں سے 0.8 ٹیٹرا واٹ پن بجلی 0.7 ٹیٹرا واٹ نیوکلیائی، 0.9 ٹیٹرا واٹ لکڑی کا ایندھن، 0.4 ٹیٹرا واٹ فصلوں کا فضلہ اور 0.2۔

ٹیٹرا واٹ جانوروں کا فضلہ تھا۔ ایک ٹیٹرا واٹ 1012 واٹ کے برابر ہے۔ اگر دنیا کی آبادی 6x109 لگائی جائے تو 13.2 ٹیٹرا واٹ کا مطلب ہو گا کہ ایک شخص اوسطاً 2.2 کلو واٹ خرچ کرتا ہے۔ لیکن توانائی کی عالمی تقسیم نہایت غیر مساوی ہے۔ شمالی امریکہ میں توانائی کا خرچ 12 کلو واٹ فی نفر ہے جبکہ بنگلہ دیش میں یہی شرح 0.1 کلو واٹ فی نفر ہے۔

اونچے صنعتی خطوں اور کم ترقی یافتہ علاقوں میں توانائی کے خرچ کا یہ فرق ٹیبل 8.3 میں بھی نظر آتا ہے۔ امریکہ میں فی نفر تیل کی کھپت اس وقت بھی چین کے مقابلے میں بیس گنا اور انڈیا کے مقابلے میں سینتیس گنا زیادہ ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب چین اور بھارت بھی اپنی تمام تر آبادی کے ساتھ امریکہ، جاپان اور یورپ کی شرح کھپت کو پہنچیں گے تو کیا بنے گا۔

ٹرانسپورٹیشن میں استعمال ہونے والی توانائی کا نوے فیصد پٹرولیم سے حاصل ہوتا ہے اور یہ تناسب زراعت میں بالخصوص زیادہ ہے۔ چنانچہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر لحظہ بڑھتی آبادی کے اس سیارے پر تیل کی قیمتیں اتنی بڑھنے والی ہیں تو زراعت اور خوراک کی فراہمی پر پڑنے والے دباؤ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ آج بھی بھوک زیادہ تر کمزور اقتصادیات کے حامل ممالک کا مسئلہ ہے۔ مستقبل میں یہی اقوام خوراک کی قلت سے زیادہ متاثر ہوں گی۔

ٹیبل 8.1 اور 8.2 کے تقابل سے پتہ چلتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ سالانہ سات بلین بیرل پٹرول خرچ کرتا ہے جبکہ اس ملک کے ریزرو اور غیر دریافت شدہ وسائل کا تخمینہ بلین بیرل اور 49 بلین بیرل کا ہے۔ چنانچہ اگر یہ ملک اپنے استعمال کو 2001ء کی شرح پر رکھے اور صرف اپنے وسائل پر انحصار کرے تو اس کے اپنے وسائل صرف چودہ برس میں خرچ ہو جائیں گے۔ امریکہ اپنی ضرورت کا آدھا تیل درآمد کرتا ہے۔ نیشنل انرجی پالیسی کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کی تیل کی پیداوار جو 2002ء میں 3.1 بلین بیرل سالانہ تھی 2020ء میں کم ہو کر 2.6 بلین بیرل رہ جائے گی جبکہ اس کی کھپت میں اضافہ ہوگا اور یہ 7.2 بلین

MashalBooks.org

Table 8.3

Ultimately recoverable coal, oil and natural gas reserves. 1 TWy=^{12}10 Watt-year= 5 billion barrels of oil= 1 billion tons of coal. (From BP Statistical Review of World Energy, London, 1991). US ultimately recoverable reserves of oil and domestic consumption (in 2001) are shown for comparison. If the US used only its domestic oil, its reserves would soon be exhusted. However, the United States imports much of its petroleum from the Middle-East.

	Global reserves	1990 global rate of cnsumption	Year left at 1990 rate of use
Coal	6700TWy	3.2TW	2000 years
Oil	300TWy	*p-1y 4.6TW	65 years
Natural Gas	300TWy	2.4TW	125 years p-1y
Total	7300TWy	10.2TW	(716 years)

	US reserves	2001 US rate of consumption	Years left at 2001 rate of use
Oil	20 TWy	1.4 TW	14 years

بیرل سالانہ سے بڑھ کر 9.3 بلین بیرل سالانہ ہوجائے گی۔ ریاستہائے متحدہ جو آج اپنی ضروریات کا 57 فیصد درآمد سے پورا کرتا ہے 2020ء میں اپنی ضروریات کے 72 فیصد کے لیے درآمد پر انحصار کرنے لگے گا۔

ان اعداد وشمار سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ریاستہائے متحدہ اپنے پٹرول کے استعمال کی شرح برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے درآمدہ تیل پر انحصار کرنا ہوگا اور یہ بھی اہم بات ہے کہ اس تیل کا زیادہ تر حصہ دنیا کے ان خطوں سے آتا ہے جو سیاسی طور پر غیر مستحکم ہیں یا ان کا رویہ امریکہ کے ساتھ غیر دوستانہ ہے۔ چنانچہ عجب نہیں کہ امریکہ نے دنیا کے تیل کے خطوں میں اتنی بڑی فوجی قوت لگا رکھی ہے۔

19 مارچ 2001ء کو نیشنل انرجی سمٹ سے خطاب کرتے ہوئے انرجی سیکرٹری سپنسر ابراہم نے کہا تھا کہ اگلے دو عشروں میں امریکہ کو توانائی کی فراہمی کے ایک بڑے بحران کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس چیلنج کا سامنا کرنے میں ناکامی پر ہماری اقتصادی خوشحالی کو خطرہ

MashalBooks.org

لاحق ہوگا۔ ہمیں اپنی سلامتی پر سمجھوتے کرنا پڑیں گے اور ہمیں اپنا انداز زندگی بدلنا پڑے گا۔''

پٹرولیم اور جنگ کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے۔ گلوبل پالیسی فورم کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جیمز اے پال نے اس تعلق کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے: ''جدید جنگ کا انحصار پٹرول پر ہے۔ ہتھیاروں کے تقریباً تمام نظاموں کا انحصار تیل سے چلنے والے ٹینکوں، ٹرکوں، توپ خانوں، ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں پر ہے۔ اسی لیے طاقتور اقوام کی حکومتیں چاہتی ہیں کہ دوران جنگ تیل کی فراہمی تسلسل کے ساتھ جاری رہے اور ان کی فوجیں میدان عمل میں تعطل کا شکار نہ ہونے پائیں۔

امریکہ اور برطانیہ جیسی حکومتوں کو اپنی عالمی جنگی صلاحیت برقرار رکھنے کے لیے تیل کمپنیوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح تیل کمپنیوں کو تیل کے عالمی کنوؤں اور ترسیل پر حاوی رہنے کے لیے اپنی حکومتوں کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کچھ تعجب نہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی تیل کمپنیاں دنیا کے طاقت ور ترین ممالک میں واقع ہیں۔

دنیا میں تیل پیدا کرنے والے تقریباً سب ممالک میں بدعنوان اور غیر جمہوری حکومتیں مسلط ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی ترقی کا مسلسل عمل موجود نہیں۔ انڈونیشیا، سعودی عرب، لیبیا، عراق، ایران، انگولا، کولمبیا، وینز ویلا، کویت، میکسیکو، الجیریا اور تیل پیدا کرنے والے دیگر ممالک میں آمریت موجود ہے جسے بالعموم غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی مدد سے آنے والے خونیں انقلابوں کے ذریعے مسلط کیا گیا ہے۔ ان حکومتوں کو اسلحہ سے تقویت دی گئی ہے۔''

مغرب کی تیل کی بھوک نے بالخصوص عراق میں کئی ایسی جنگوں کو جنم دیا ہے۔ برطانیہ نے پہلی جنگ عظیم کے دوران یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ سے چھینا تو اسے میسو پوٹیمیا کہا جاتا تھا۔ اگرچہ لارڈ کرزن* کو اس امر سے انکار تھا لیکن شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ برطانیہ علاقے کے پٹرول پر کنٹرول چاہتا تھا۔ مثال کے طور پر کابینہ میں کرزن کا شریک کار سر ماریس ہینکے (Maurice Hankey) ایک نجی خط میں لکھتا ہے کہ ''تیل جنگی مقاصد میں سے سرفہرست ہے۔'' مزید برآں برطانوی افواج نے جنگ بندی کے مرڈوس (Murdos) معاہدے کے بعد بھی لڑائی جاری رکھی اور تیل پیدا کرنے والے ایک بڑے

** برطانوی جنگی کابینہ کا ایک رکن جو جنگ کے فوراً بعد وزیر خارجہ بنا۔

خطے کے دارالحکومت موصل پر قابض ہو گئے۔ یوں فرانسیسی اس علاقے سے محروم ہوئے حالانکہ سائیکس۔پائیکوٹ (Sykes-Picot) معاہدے میں یہ علاقہ فرانس کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لارڈ کرزن کو تیل کی عسکری اہمیت کا بخوبی علم تھا اور اس نے جنگ عظیم اول کے اواخر میں تبصرہ کیا تھا، ''اتحادیوں نے تیل کی موج پر تیرتے فتح حاصل کی ہے۔''

1918ء سے 1930ء تک کے دورانیہ میں عراقیوں نے برطانوی تسلط کے خلاف مزاحمت کی جسے زہریلی گیس، ہوائی قوت، ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے استعمال سے کچل دیا گیا۔ تب ونسٹن چرچل سیکرٹری نو آبادیات تھا۔ اس نے قرار دیا کہ عراقی تنازعہ عسکری نو آبادیاتی طریقوں کی اہم آزمائش ثابت ہوگا۔

1932ء میں برطانیہ نے عراق کو برائے نام آزادی دے دی لیکن اس کی فوج بڑی تعداد میں یہاں رہی۔ 1941ء میں جرمن خطرے کا بہانہ بنا کر برطانیہ نے ایک بار پھر یہاں کا سیاسی اقتدار سنبھال لیا۔ برطانیہ کو خبر تھی کہ تیل کے عراقی کنویں صرف جرمنی کی نظر میں نہیں بلکہ ان پر امریکہ کی نظر بھی ہے۔

جلد بعد ہونے والے واقعات نے برطانوی خدشات کی تصدیق کر دی۔ 1963ء میں امریکی پشت پناہی سے آنے والے فوجی انقلاب کے نتیجے میں صدام حسین کی بعث پارٹی برسر اقتدار آئی۔* 1979ء میں شاہ ایران کی حکومت ختم ہوئی تو امریکہ کو فکر لاحق ہوئی کہ بنیاد پرست شیعہ حکومت مشرق وسطیٰ کے تیل کی فراہمی میں رخنہ ڈال سکتی ہے۔ ایرانی حکومت کو یت اور سعودی عرب کو امریکہ نواز تصور کرتی تھی۔ ان خطرات کے تدارک کے لیے امریکہ نے صدام حسین کو ایران کے خلاف کھڑا کر دیا۔

1980ء میں صدام حکومت نے ایران پر حملہ کیا اور یوں آٹھ سالہ خونریز جنگ کا آغاز ہوا جس میں طرفین کے کوئی ایک ملین لوگ مارے گئے۔ عراق نے جینیوا پروٹوکول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایران کے خلاف مسٹرڈ اور نرو دونوں زہریلی گیسیں استعمال کیں۔

ریاستہائے متحدہ اور برطانیہ عراق کو کیمیائی ہتھیاروں کی فراہمی میں ملوث تھے۔

* سی آئی اے پہلے بھی صدام کو معاونت دیتی رہی تھی۔ 1959 میں سی آئی اے نے عراقی وزیراعظم عبدالکریم قاسم کو قتل کروانے کے لیے چھ افراد کا جو دستہ بنوایا تھا اس میں صدام بھی شامل تھا۔

MashalBooks.org

فلوجہ۔ II نامی ایک کیمیائی پلانٹ برطانیہ نے 1985ء میں فراہم کیا۔ مسٹرڈ اور نروگیسیں دونوں اسی میں تیار کی گئیں۔ 25 مئی 1994ء کو امریکی سینیٹ کے سامنے پیش کردہ ریگل (Rigel) رپورٹ کے مطابق عراق کو کیمیائی ہتھیاروں کے لیے ضروری مواد کی فراہمی پر ریگن انتظامیہ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اور یہی حال حیاتیاتی ہتھیاروں کی بنیاد بننے والے انتھراکس اور پلیگ کلچر کا تھا۔

1984ء میں مشرق وسطیٰ کے لیے ریگن کے ایلچی ڈونلڈ رمز فیلڈ نے صدام حسین کے ساتھ ملاقات میں اسے زہریلی گیسوں کے استعمال کے باوجود امریکی دوستی کا یقین دلایا۔ 1998ء میں جب صدام نے کرد دیہاتوں پر بھی زہریلی گیس استعمال کی تو امریکہ نے اس کے خلاف مذمتی قرارداد پاس نہ ہونے دی۔ لگتا تھا کہ امریکہ نے اسے علاقے میں ہر طرح کی چھٹی دے رکھی ہے۔

شکل 8.1 عراق میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات جو ہزاروں میں دی گئی ہیں۔ اس کی بنیاد یونیسف کے مطالعہ پر ہے۔ گراف سے پتہ چلتا ہے کہ پابندیوں نے شرح اموات کو کس طرح متاثر کیا۔ اعداد و شمار کے مطابق ان پابندیوں کے نتیجے میں نصف ملین سے زیادہ بچے ہلاک ہوئے۔

MashalBooks.org

25 جولائی 1990ء کو امریکی سفیر اپریل گیلیسپی نے صدام حسین سے ملاقات میں تیل کی قیمت اور ایران۔ عراق تعلقات پر گفت وشنید کی۔ اس ملاقات میں مسز گیلیسپی نے صدام کو یقین دلایا، ''کویت کے ساتھ آپ کے سرحدی تنازعات جیسے عربوں کے باہمی اختلافات پر امریکہ خاموش رہے گا۔'' پھر وہ چھٹی پر چلی گئی۔ صدام حسین نے اسے اجازت خیال کرتے ہوئے آٹھ دن کے بعد کویت پر حملہ کر دیا۔

اس حملے پر مغربی حکومتوں اور تیل کی کمپنیوں کو تشویش تھی۔ صدام کا اگلا نشانہ سعودی عرب بھی ہوسکتا تھا۔ جارج بش سینیئر نے بیان دیا، ''ہمارے کام، ہماری طرز حیات اور ہماری اور دنیا بھر میں پھیلے ہمارے دوست ممالک کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ دنیا میں تیل کے سب سے بڑے ذخائر کو صدام حسین کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہیے۔''

6 اگست 1990ء کو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے عراق کے خلاف بڑی جامع اقتصادی پابندیاں لگا دیں تا کہ اسے کویت سے نکلنے پر مجبور کیا جاسکے۔ اس اثنا میں ریاستہائے متحدہ کے اسٹیٹ سیکرٹری جیمز اے بیکر نے دھونس دھاندلی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے عراق کے خلاف اقوام متحدہ کے فوجی حملے کی تائید حاصل کر لی۔ بیکر کے اپنے الفاظ ہیں کہ اس نے اس کامیابی کے لیے دھمکی، دھونس دھاندلی اور بعض جگہ خرید کے طریقے استعمال کئے۔

29 نومبر 1990ء کو سلامتی کونسل نے قرار داد 678 کے ذریعے تمام ضروری ذرائع عراق کے خلاف استعمال کرنے کی قرار داد پاس کر دی۔ اس قرارداد میں فوجی قوت کا استعمال مضمر تھا۔ چونکہ سلامتی کونسل نے ریاستوں کو اپنے ہمسایوں میں دراندازی سے منع کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ قرار داد عین جائز تھی۔ ہاں البتہ یہ سوال ضرور پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر اس سارے معاملے میں تیل ملوث نہ ہوتا تو یہ سارا ردعمل اتنا ہی بھرپور ہوتا۔ تقابل کے لیے ہم روانڈا کی مثال لے سکتے ہیں جہاں 1994ء میں ہونے والی نسل کشی کو روکنے کے لیے قطعی طور پر کچھ نہ کیا گیا۔ 1991ء کی جنگ خلیج کے طرز کار پر بھی بات ہوسکتی ہے۔

فوجی اہداف کے علاوہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر بعد از جنگ مقاصد کے پیش نظر اس کے بجلی گھر بھی تباہ کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے بعد وہ انہیں غیر ملکی تکنیکی معاونت کے بغیر دوبارہ تعمیر نہیں کر پائے گا اور بعد از جنگ اسے انہی ملکوں کی

MashalBooks.org

فرموں کو ٹھیکے دینا پڑیں گے۔ اس دوران ہسپتالوں اور پانی صاف کرنے کے پلانٹوں کو بجلی نہیں ملے گی۔ جنگ خلیج میں اتحادی جہازوں اور ٹینکوں نے یورینیئم کے خول والے گولے چلائے۔ نتیجتاً عراق میں کینسر بڑھ گیا۔ انہوں نے عراقی کردوں اور شیعوں کو صدام حکومت کے خلاف بغاوت میں شہ دی اور بعد ازاں صدام کے ہاتھوں ذبح ہونے کے لیے اکیلے چھوڑ کر ایک طرف ہوگئے۔ طاقت کا بدترین استعمال یہ تھا کہ امریکہ اور برطانیہ نے جنگ کے بعد بھی عراق کے خلاف پابندیاں لگوائے رکھیں۔ انہوں نے اپنی ویٹو پاور استعمال کرتے ہوئے یہ پابندیاں اٹھنے نہ دیں۔ ان کا مقصد تھا کہ ان پابندیوں کے اقتصادی و نفسیاتی اثر میں آکر عراقی عوام صدام کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ تاہم وہ ظالم آمر بھی پولیس اور پروپیگنڈے کے زور پر اپنی جگہ جما رہا۔ ان پابندیوں کے نتیجے میں پانچ سال سے کم عمر کے پانچ لاکھ بچے مر گئے۔ یہ امر یونیسف کے اعداد و شمار سے ثابت ہے اور شکل 1 میں دکھایا گیا ہے۔ شہریوں میں ان پابندیوں کے نتیجے میں ہونے والی اموات ایک ملین سے زیادہ تھیں۔

1991ء کے بعد عراق میں ان پابندیوں کے نتائج کا مطالعہ کرنے کے بعد ریمزے کلارک نے سلامتی کونسل کو مطلع کیا کہ زیادہ تر اموات غذا کی کمی کے باعث لاحق ہوئی ہیں۔ ان میں سے 88 فیصد پیچش سے متاثر تھے جو خراب پانی یا غذا کے نتیجے میں پیدا ہوئی اور جس پر عام حالات میں بآسانی قابو پایا جاسکتا تھا۔ ان سے زیادہ ظالمانہ اموات نہیں ہوسکتیں۔ یہ بچے آہستگی سے اور بڑی بے بسی کے ساتھ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انہیں نہایت معمولی اور عام سے علاج بھی میسر نہیں اور نہ ہی درد کم کرنے کی کوئی معمولی سے معمولی دوا۔

11 ستمبر 2001ء

11 ستمبر 2001ء کو دو اغوا شدہ ہوائی جہاز نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ساتھ ٹکرا دیئے گئے۔ تین سکائی سکریپر گرے اور تین ہزار سے زائد لوگ مر گئے۔ تقریباً اسی وقت ہائی جیک ہونے والا ایک تیسرا ہوائی جہاز واشنگٹن ڈی۔سی میں واقع پینٹاگون سے ٹکرایا گیا اور ایک چوتھا جہاز پنسلوانیا کے کھیت میں تباہ ہوا۔ یہ چوتھا جہاز غالباً وائیٹ ہاؤس یا کیپٹول (Capitol) سے ٹکرایا جانا تھا لیکن اس کے مسافر ہائی جیکروں کے عزائم سے باخبر ہوگئے اور انہوں نے ہائی جیکروں پر قابو پا لیا۔

MashalBooks.org

11 ستمبر کے حملوں کا الزام بہت جلد سعودی عرب کے دولت مند اسلامی انتہا پسند اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم ''القاعدہ'' پر عائد کر دیا گیا۔ بعد ازاں بن لادن نے ان حملوں کی ذمہ داری قبول کر لی اور قرار دیا کہ اس کی بڑی وجوہات میں سے ایک تو یہ تھی کہ امریکہ نے اسرائیل کا ساتھ دیا اور دوسرے امریکہ نے اپنے فوجی دستے سعودی عرب میں رکھ چھوڑے ہیں۔

صدام حسین کی طرح بن لادن بھی سی آئی اے کی پیداوار تھا۔ اس کی ترتیب اور اسے اسلحہ کی فراہمی سب سی آئی اے کی کارگزاری تھی۔ سی آئی اے کے ساتھ بن لادن کے تعلقات کا آغاز 1979ء میں ہوا جب سی آئی اے پاکستان کی آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر مجاہدین کو اسلحہ اور تربیت فراہم کر رہی تھی۔ اسی نے مجاہدین کو ایک بین الاقوامی قوت بنایا۔ ان لوگوں نے افغانستان کی سیکولر حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ تب ریاستہائے متحدہ کے قومی سلامتی کے مشیر برزنسکی نے پیشنگوئی کر دی تھی کہ افغانستان کی سوشلسٹ حکومت کو بچانے کے لیے سوویت یونین اپنے دستے بھجوانے سے گریز نہیں کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ یوں چھڑنے والی جنگ سوویت یونین کے لیے ویت نام ثابت ہوگی۔ امریکی سمجھتے تھے کہ اس طرح سوویت یونین پر مہلک اور کاری ضرب لگے گی۔ برزنسکی کا خیال تھا کہ سوویت یونین کو افغانستان میں الجھا کر وہ مشرقی یورپ کو سوویت تسلط سے چھڑا سکتا ہے۔ اپنے 1998ء کے ایک انٹرویو میں پولینڈ نژاد برزنسکی نے استفسار کیا: ''تاریخ عالم میں اہم کیا ہے؟ طالبان یا سوویت یونین کا انہدام؟ کچھ مسلمانوں میں ہلچل یا وسطی یورپ کی آزادی؟'' درحقیقت ہلچل میں اٹھ بیٹھنے والے چند مسلمان ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے 11 ستمبر 2001ء کو ٹوئن ٹاور میں جہاز جا ٹکرائے۔

بن لادن کا باپ ایک انتہائی دولت مند سعودی گھرانے کا سربراہ تھا۔ وہ ایک بہت بڑی تعمیراتی کمپنی کا مالک تھا اور سعودی شاہی گھرانے کے ساتھ ساتھ امریکہ میں بش گھرانے کے ساتھ بھی اس کے قریبی تعلقات تھے۔ اپنے باپ کی اس تعمیراتی کمپنی کے ذریعے ہی بن لادن پاکستان اور افغانستان میں مجاہدین کے لیے سڑکیں اور ٹھکانے بنانے کے کام میں آیا۔ بن لادن نے مجاہدین اکٹھے کئے اور ان کے لیے امداد ڈھونڈتا رہا۔ امریکی معاونت کے ساتھ تین سال تک لڑنے کے بعد مجاہدین سوویت یونین کو شکست دینے اور

MashalBooks.org

افغانستان پر حاوی ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ آٹھ سالوں میں سی آئی اے نے اسلامی عسکریت پسندوں کو تربیت اور اسلحہ دینے پر کوئی تین بلین ڈالر خرچ کیے۔

سعودی شاہی گھرانے سے قریبی تعلقات کے باوجود اسامہ بن لادن کے خیالات انتہا پسند ہونے لگے جن پر وہابیوں کا ٹھپہ تھا۔* اس کی خواہش تھی کہ امریکہ کو مشرقی وسطیٰ سے نکال دے۔ بالخصوص وہ امریکی دستوں کو سعودی عرب سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس کا ایک خواب یہ بھی تھا کہ سعودی حکمرانوں کا تختہ الٹ دے۔ شائد اس نے یہ خواب بھی دیکھا ہو کہ عالمی تیل پر تسلط کے ذریعے ایک اسلامی ریاست تشکیل دے لے۔

افغانستان میں سوویت دستوں کی شکست کے بعد اسامہ بن لادن سعودی عرب لوٹا جہاں اس کے اہل خانہ کاروبار میں مصروف تھے۔ 1991ء میں اسے حکومت خلاف سرگرمیوں پر ملک سے نکال دیا گیا۔ اس نے سوڈان میں پناہ لی اور اگلے پانچ سال تک وہیں رہا۔

بن لادن پر شبہ کیا جاتا ہے کہ اس نے 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بم حملہ کروایا اور 1998ء میں دو امریکی سفارتخانوں پر ہونے والے حملوں میں بھی ملوث تھا۔ جب سوڈان اسامہ اور اس کی تنظیم کے لیے غیر محفوظ ہو گیا تو اس نے افغانستان کی راہ لی جہاں طالبان برسر اقتدار آ چکے تھے۔ مجاہدین کے ساتھ قریبی تعلقات کے سبب طالبان نے بن لادن کو خوش آمدید کہا۔

طالبان کا آغاز پاکستان میں پشتون دینی طالب علموں کے گروپ کے طور پر ہوا جہاں انہیں سعودی طرز کی اسلامی بنیاد پرستی پڑھائی گئی تھی۔ طالبان کا مطلب ہی طالب علم ہے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ پاکستان میں موجود پناہ گزیں کیمپوں میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی ساری زندگی جنگ میں گزاری۔ نتیجتاً طالبان انتہا کی قدامت پسند عسکری قوت بنی۔ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے پچھلی حکومتوں کے بعض ترقی پسند اقدامات مکمل طور پر ختم کر دیئے۔ بالخصوص عورت کو پس منظر میں دھکیلا گیا اور ہیروئن کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔

* مسلمانوں کے وہابی فرقے کی بنیاد عبدالوہاب نے رکھی۔ یہ لوگ قرآن کے شدید اور لفظی اتباع کے حوالے سے معروف ہیں۔ اس فرقے کو سعودی عرب میں زیادہ فروغ ملا۔

MashalBooks.org

عراق کے متعلق مذکورہ بالا بحث میں تیل کو مغربی اقدامات کا محرک ٹھہرایا گیا تھا۔ افغانستان میں بھی یہی مقاصد کارفرما تھے۔ تیل کی امریکی کمپنیاں عرصۂ دراز سے ترکمانستان سے تیل کی پائپ لائن بذریعہ افغانستان بحیرۂ عرب تک لانا چاہتی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ کمپنیاں براستہ افغانستان و پاکستان گیس کی پائپ لائن بچھانے میں بھی دلچسپی لے رہی تھیں۔

11 ستمبر کو دہشت گردوں کے حملوں کے بعد دنیا کی ہمدردیاں امریکہ کے ساتھ ہوگئیں۔ یہ زمانہ قومی بحران کا دور قرار پایا اور امریکی صدر بش کو غیر مشروط حمایت ملنے لگی۔ لگتا ہے کہ حملے کے ردِعمل میں بش نے اپنے مشیروں سے پوچھا کہ آیا وہ عراق پر حملے کے لیے آزاد ہے۔ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے قائم ادارے کے سابقہ سربراہ رچرڈ کلارک کا کہنا ہے کہ نائن الیون کے بعد بش پر عراق کو نشانہ بنانے کا خبط سوار ہو گیا تھا۔

ان حملوں کے نو دن کے بعد برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر وائٹ ہاؤس کے ایک نجی کھانے میں بطور مہمان مدعو تھا۔ واشنگٹن میں سابقہ برطانوی سفیر سر کرسٹوفر میئر بھی کھانے پر موجود تھا۔ میئر کے مطابق بلیئر نے بش سے کہا کہ انہیں اپنے اصل مقاصد یعنی طالبان کے ساتھ معاملہ کرنے اور افغانستان میں القاعدہ سے نمٹنے سے نہیں ہٹنا چاہیے۔ بش نے جواباً کہا، ''مجھے تم سے اتفاق ہے ٹونی۔ ہمیں پہلے یہی کرنا ہوگا لیکن افغانستان سے نمٹتے ہی واپس عراق کی طرف آنا ہوگا۔'' میئر کا کہنا ہے کہ عراق اور افغانستان دونوں کے ساتھ جنگ کے امکان پر بلیئر نے کسی طرح کا کوئی احتجاج نہ کیا۔

2002ء کے گرما کے دوران بش اور بلیئر دونوں عراق پر بذریعہ ٹیلی فون بات کرتے رہے۔ وائس پریذیڈنٹ ڈک چینی کے دفتر کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے اس ٹیلی فون کال کے مندرجات پڑھے اور ان کے حوالے سے معروف رسالے ''Vanity Fair'' کو بتایا، ''مندرجات سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں صدام کے عزائم کا علم تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اقدامات کرنے والے ہیں اور صدام حکومت سے جانے والا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اقدامات کرنے والے ہیں اور اس کی حکومت کو ہٹا دیں گے اور وہ جو کر رہے ہیں درست ہے۔ بلیئر کو کسی طور قائل کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ ہر بات پر ہاں کہہ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے کیا پڑھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اگلے

MashalBooks.org

برس کیا ہونے والا ہے۔''

یکم جون 2002ء کو بش نے نئی امریکی حکمتِ عملی کا اعلان کیا جو نہ صرف امریکی خارجہ پالیسی کے تمام پچھلے نظائر کے خلاف تھی بلکہ اس نے اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کی پرواہ بھی نہ کی۔* اس نے ویسٹ پوائنٹ کی ملٹری اکیڈمی کی گریجویشن تقریب سے خطاب کرتے ہوئے زور دیا کہ امریکہ کو کسی بھی ایسے ملک پر حفظِ ماتقدم کے طور پر حملے کا حق حاصل ہے جو مستقبل میں کبھی اس کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہو۔ اس کا کہنا تھا، ''اگر ہم نے دھمکیوں پر عمل درآمد کا انتظار کیا تو پھر ہمیں کچھ زیادہ ہی لمبا انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے ساٹھ یعنی کہ دنیا کے ایک تہائی ممالک گنوا دیئے جو امریکہ پر اس طرح کے حملے کا باعث بن سکتے ہیں۔

امریکہ یا کوئی اور ملک حفظِ ماتقدمی حملے کی بات کرتا ہے تو یہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے باب اوّل میں مذکور شق نمبر 2.3 اور 2.4 کی واضح خلاف ورزی کرتا ہے۔ اِن شقوں کے تحت تمام رکن ممالک اپنے تنازعات ایسے پرامن ذرائع کے ذریعے طے کرنے کے پابند ہیں کہ بین الاقوامی امن و سلامتی خطرے میں نہ پڑیں اور یہ کہ تمام رکن ممالک اپنے بین الاقوامی تعلقات میں کسی ریاست کی علاقائی سلامتی کے خلاف قوت استعمال نہیں کریں گے اور نہ ہی ایسا کرنے کی دھمکی دیں گے۔ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق کسی ملک کو حملے کی صورت میں اپنے دفاع کا حق حاصل ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک سیکورٹی کونسل حرکت میں نہیں آجاتی۔

حفظِ ماتقدمی جنگ کے بش کے اصول کی کیتھولک چرچ نے بھی مخالفت کی ہے۔ چرچ کے اعلیٰ عہدیداران نے اسے یکطرفہ کارروائی قرار دیتے ہوئے ناقابل قبول کہا ہے۔ تاہم امریکہ میں بش کی اس تقریر پر کھل کر بات نہیں ہوئی۔ یہ تقریر دہشت گردی کے حملوں کے چند ماہ بعد کی گئی اور امریکی سمجھتے ہیں کہ ان کا صدر امریکی سلامتی کے لیے ہر مناسب قدم اٹھا سکتا ہے۔ دہشت گردی سے پریشان امریکی شہری حفظِ ماتقدمی جنگ کے اصول کا ادراک نہیں کر پائے کہ یوں تقریباً ہر طرح کی جارحیت منصفانہ قرار پاتی ہے اور اگر یہ اصول تمام ممالک اپنا لیتے ہیں تو بالآخر پوری دنیا اور خود امریکہ کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔

* وہ پہلے بھی کئی اہم معاہدے منسوخ کر چکا تھا۔

MashalBooks.org

امریکی اخبارات اور ذرائع ابلاغ کا بالواسطہ جائزہ بتاتا ہے کہ امریکیوں کی ایک قابل ذکر تعداد بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار رکھنے والی قوموں کے حق میں امریکی اقدامات کو جائز قرار دیتی ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ حملے کا اصل مقصد وسائل پر قبضہ بھی ہوسکتا ہے۔

سلطنت؟

قدیم زمانے میں قائم سلطنتیں ان ادوار کی ٹیکنالوجی کی بدلت قائم رکھی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر رومن سلطنت سڑکوں اور پلوں کی تعمیر میں کامیابیوں کے بل بوتے پر عرصے تک شان وشوکت سے قائم رہی۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں موجود سلطنت کے کسی بھی گوشے میں بغاوت کے آثار نمودار ہوتے تو شاہی دستے برق رفتاری سے اسے کچلنے کو پہنچ جاتے۔ برطانوی سلطنت ماضی کی کسی بھی سلطنت کے مقابلے میں بڑی تھی۔ اسے بھی مشین گنوں اور جہازوں کی بدولت کم ترقی یافتہ انسانوں پر برتری حاصل تھی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی ٹیکنالوجی نے سلطنتوں کو اسی طرح کے فائدے پہنچائے۔ صنعتی انقلاب نے زور پکڑا تو ترقی یافتہ ممالک کے خام مال کافی نہ رہے اور ان کی مصنوعات بھی مقامی کھپت سے بہت بڑھ گئیں۔ صنعتی ممالک کو معدنیات، لکڑی، ربڑ اور سن وغیرہ کی فراہمی کے لیے نوآبادیوں کی ضرورت تھی۔* ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنا کپڑا، جوتے، اوزار، کھلونے، گھڑیاں اور دیگر تیار مال بیچنے کے لیے بھی منڈی درکار تھی۔ محنت کی یہ تقسیم کالونیوں کے مقابلے میں صنعتی ممالک کے لیے کہیں زیادہ سودمند رہی۔ آج کی دنیا میں بھی ترقی یافتہ صنعتی ممالک اور دنیا کے کم ترقی یافتہ علاقوں کے درمیان اسی طرح کے غیر منصفانہ اقتصادی تعلقات موجود ہیں۔ آج کی دنیا میں موجود غربت اور دولت کے تکلیف دہ فرق اسی نظام کا نتیجہ ہیں۔

جارج آرویل نے برما میں برطانوی پولیس میں طویل خدمات سرانجام دینے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ نظام سلطنت میں سپاہی غریب ایشیائی کو زمین پر لٹائے رکھتا ہے اور تاجر

* اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مرکنٹائل نظام کے تحت نوآبادیوں پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ خود صنعت قائم نہیں کریں گی۔ اور نہ ہی سوائے سلطنت کے کسی دوسرے ملک کے ساتھ تجارتی روابط بنائیں گی۔

MashalBooks.org

اس کی جیبیں جھاڑ لیتا ہے۔ اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا اور نو آبادیاتی تجربے پر مبنی اپنی کتاب "Burmese Days" لکھی۔ یہ کتاب آج بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ آرویل کی کتاب 1984ء بھی کم آگہی بخش نہیں۔

طویل عرصے تک برطانیہ صنعتی اور نو آباد کار قوت رہا۔ 1890ء کے بعد جرمنی، ریاستہائے متحدہ، بلجیئم، فرانس، اٹلی، روس اور جاپان اس کے تسلط کو چیلنج کرنے لگے تھے۔ یہ صنعتی ملک قدرتی وسائل، منڈی اور فوجی قوت جیسے میدانوں میں سبقت لے جانے کے لیے باہم الجھے تو پہلی جنگ عظیم ہوئی۔ جنگ کے اواخر میں جمعیتِ اقوام نے کئی سابقہ نو آبادیاں فاتحین کو بطور پروٹیکٹوریٹ سونپ دیں۔ اصولاً تو یہ علاقے عارضی عملداری میں دیئے گئے تھے لیکن عملاً یہ کالونی بنانے کا ایک نیا نظام تھا۔

جنگ عظیم دوم اتنی خوف ناک تھی کہ عالمی رہنماؤں نے جنگ کا ادارہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا سوچا۔ تمام تر کمزوریوں کے باوجود اقوام متحدہ نو آبادکاری کا عہد ختم کرنے میں کامیاب رہی لیکن یہ خاتمہ رسمی خاتمہ کہا جاسکتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ نو آبادکاری کے عمل نے فقط بھیس بدل لیا تھا۔ نو آبادکاری کے کلاسک عہد میں براہِ راست سیاسی حکومت وائسرائے اور گورنر جنرل کی مدد سے کی جاتی تھی اور یہ دونوں نو آبادیوں کے حکمراں ہوا کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریباً سبھی نو آبادیوں کو باقاعدہ آزادی دے دی گئی لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک پسماندہ دنیا پر مسلط رہے۔ ہاں البتہ براہِ راست سیاسی اقتدار کی جگہ بالواسطہ طریقوں نے لے لی۔

دو عالمی جنگوں کے بعد ریاستہائے متحدہ دنیا کی غالب سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھرا اور اس نے وہی مقام حاصل کر لیا جو انیسویں صدی میں برطانیہ کو حاصل تھا۔ ان دو جنگوں نے اس کے حریفوں کی اقتصادیات تباہ کر دی تھی۔ لیکن خود امریکی سرزمین پر کوئی لڑائی نہ ہوئی تھی۔ 1945ء میں یہ واحد بڑا ملک تھا جس کی اقتصاد مکمل طور پر محفوظ رہی۔ چنانچہ جنگ کے بعد ریاستہائے متحدہ نے خود کو تقریباً نہ چاہتے ہوئے بھی عالمی دنیا کی سیاسیات کے عین مرکز میں پایا۔

امریکہ نے قدرے تذبذب کے ساتھ آزاد دنیا کے رہنما کا اپنا نیا کردار سنبھالا۔ امریکہ کا سابقہ رویہ قدرے علیحدگی پسندی کا چلا آرہا تھا کہ وہ یورپ کے جھگڑوں اور جنگوں

سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ تاہم جنگ عظیم دوم کے بعد اس خواہش کی جگہ بین الاقوامی کردار سرگرمی سے ادا کرنے کی خواہش نے لے لی۔

دنیا بھر میں نئی امریکی دلچسپی تیزی سے ترقی کرتی صنعتی اقتصاد کی عکاس بھی ہو سکتی تھی اور منڈی اور خام مال کی ضرورت بھی۔ موخرالذکر دونوں ضرورتیں سلطنتوں کا کلاسیکی محرک چلی آرہی ہیں۔ لیکن پبلک میں تاثر دیا گیا کہ اصل مسئلہ کمیونزم کا خطرہ ہے۔ امریکی جماعتوں نے اپنے ووٹروں کے سامنے جواز پیش کیا کہ وہ اس خطرے کے پیش نظر دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت پر مجبور ہیں (آج جبکہ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے تو غیر ملکی مداخلت کا جواز فراہم کرنے کے لیے کسی اور محرک کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کمیونزم کے خلاف مقدس جنگ کی جگہ دہشت گردی کے نعروں نے لے لی ہے)۔

1945ء سے لے کر اب تک کے دورانیے میں امریکہ بہت سے ممالک کے اندرونی معاملات میں ملوث ہوتا چلا آیا ہے۔ 1945ء سے 1949ء تک چین، 1947-48ء اٹلی، 1947-49ء یونان، 1946ء تا 1953ء فلپائن، 1945ء تا 1953ء جنوبی کوریا، 1949ء تا 1953ء البانیہ، پچاس کا عشرہ جرمنی، 1953ء ایران، 1953ء تا 1990ء کا پورا عشرہ گوئٹے مالا، 1956ء تا 1958ء مشرقی وسطیٰ، 1957-58ء انڈونیشیا، 1953-64ء برٹش گیانا، 1950ء تا 1973ء ویت نام، 1955-73ء کمبوڈیا، 1960ء تا 1965ء کانگو۔ زائر، 1961ء تا 1964ء برازیل، 1963ء تا 1966ء ڈومینیکن ریپبلک، 1961ء تاحال کیوبا، 1965ء انڈونیشیا، 1964-1973ء چلی، 1964ء تا 1974ء یونان، 1975ء تاحال مشرقی تیمور، 1978ء تا 1989ء نکاراگوا، 1979ء تا 1984ء گرینیڈا، 1981ء تا 1989ء لیبیا، 1989ء پانامہ، 1990ء تاحال عراق، 1994ء ہیٹی، 1999ء یوگوسلاویہ کی صورت میں دوسرے ممالک کے معاملات میں امریکی مداخلت کی ایک مختصر سی فہرست دیکھی جاسکتی ہے۔ ان مداخلتوں کے جواز میں امریکی عوام کو ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ کمیونزم کا سدِ باب کرنے کے لیے اور ابھی حالیہ برسوں میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے یہ سب ضروری ہے۔ لیکن اس میں قطعی طور پر شبہ نہیں کہ امریکی مداخلت کے اصل محرکات ایسی حکومتوں اور قوانین کی تشکیل اور استقرار تھا جو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے اقتصادی مفادات کا تحفظ کر سکتے

MashalBooks.org

تھے۔*

توازن قائم رکھنے کی غرض سے یاد رکھنا ضروری ہوگا کہ سرد جنگ کے دوران سوویت یونین اور چین نے بھی 1950ء تا 1953ء کوریا، 1956ء ہنگری اور 1968ء میں چیکوسلواکیہ میں مداخلت کی تھی۔ مذکورہ بالا مداخلتوں کی طرح یہ مداخلتیں بھی غیر منصفانہ تھیں۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کمیونزم کے خلاف اپنے خیالات یا اس کے الٹ کو جواز بنا کر چھوٹے ممالک کے اندرونی معاملات میں خفیہ یا واضح فوجی مداخلت کرے۔ اس لیے کہ لوگوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی منتخب کردہ حکومتوں کے تحت زندگی گزاریں خواہ ان حکومتوں کی کارکردگی بہت مثالی نہیں۔

آج کی دنیا میں ریاستہائے متحدہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کی فوجوں کی بڑی تعداد دوسرے ملکوں کی سرزمین پر موجود ہے۔ دنیا میں فقط 64 ممالک ایسے ہیں جہاں امریکی فوجی تنصیبات موجود نہیں۔

ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ خارجہ نے 2003ء میں ''بیس سٹرکچر رپورٹ'' میں امریکی اڈوں کی جو فہرست دی ہے کسی طور بھی مکمل نہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق دنیا کے 130 ممالک میں 702 امریکی اڈے موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ ریاستہائے متحدہ کی ملکیت ہیں اور کچھ کرائے پر لئے گئے ہیں۔ خود امریکہ اور اس کے ساتھ ملحقہ علاقہ جات میں چھ ہزار امریکی اڈے موجود ہیں۔ بیرونِ ملک واقع اڈوں پر مقیم افراد کی تعداد دو لاکھ

* عراق پر حالیہ، اور غیر قانونی، حملے کے بعد عراق کے بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکی اور برطانوی کارپوریشنوں کے مفاد میں نئے قواعد وضع کیے گئے۔ کسی مقبوضہ ملک کے قوانین میں ترمیم 1907 کے ہیگ ریگولیشن، 1949 کے جینیوا کنونشن اور امریکی فوج کے اپنے وار کوڈ کے خلاف ہے۔ ہیگ ریگولیشن کی شق 43 کی رو سے قابض فوج کو امن وامان قائم کرنے کے لیے ہر ممکن حد تک اس کے اپنے قانون استعمال کرنے کا پابند کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کی قرارداد 1483 کے تحت عراق پر قابض فوجوں کو خاص طور پر ان دو دستاویزات کی پابندی کا کہا گیا تھا۔ برطانوی اٹارنی جنرل لارڈ گولڈسمتھ نے ٹونی بلیئر کو انتباہ کیا تھا کہ ساختی اقتصادی اصطلاحات کو بین الاقوامی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ اسی اصول کو نومی کلین نے یوں بیان کیا ہے کہ ''کسی چیز پر بمباری اس کی فروخت کا حق نہیں دیتی۔'' اس کے باوجود قابض قوتیں عراقی آئین میں تھوک کے لحاظ سے تبدیلیاں لا رہی ہیں تاکہ بیکٹل اور ہیلی برٹن جیسی کارپوریشنوں کو فائدہ پہنچایا جا سکے۔

MashalBooks.org

ترپین ہزار دوسو اٹھاسی (2,53,288) ہے۔اتنے ہی لوگ ان پر براہِ راست منحصر ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ اڈوں کی تعداد اصل سے کہیں کم دکھائی گئی ہے۔ کیونکہ اس رپورٹ میں کوسووو، افغانستان، عراق، اسرائیل، کویت، کرغیزستان، قطر اور ازبکستان میں قائم کئے گئے حالیہ اڈّوں کا تذکرہ موجود نہیں۔* پینٹاگون نے تخمینہ پیش کیا ہے کہ ان تمام اڈوں کو بدلنے کا خرچ 591 بلین ڈالر ہے۔ اڈّوں کی تعمیر مختلف کمپنیوں سے کروائی جاتی ہے جن میں کیلاگ (kellogg) براؤن اینڈ روٹ وغیرہ اہم ہیں جو ہوسٹن، ٹیکساس، میں واقع ہیلی برٹن کا رپوریشن کی ذیلی تنظیمیں ہیں۔

فروری 2004ء میں صدر جارج بش نے 2005ء کے مالی سال کے لیے کانگرس سے 401.7 بلین ڈالر کا دفاعی بجٹ منظور کرنے کی درخواست کی تھی۔* بہت بڑی ہونے کے باوجود یہ رقم بھی امریکی اقتصاد پر پڑنے والے فوجی بوجھ کو پوری طرح پیش نہیں کرتی۔ اقتصادیات کے مورخ رابرٹ ہگز کا خیال ہے کہ درست اخراجات اس سے دوگنا ہیں۔ سابقہ فوجیوں کی دیکھ بھال اور دیگر نظر نہ آنے والے اخراجات کے ساتھ ساتھ فوجی اخراجات کے لیے لیے گئے قرض پر شرح سود بھی اس میں شامل کی جاسکتی ہے۔

پینٹاگون کی ''Joint Vision of 2020'' میں بیان ملتا ہے، ''آج امریکی فوج اعلیٰ تربیت یافتہ مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے جو ہمہ وقت ہماری قوم کو فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے تیار ہے۔ ریاستہائے متحدہ کی ذمہ داریاں اور مفادات باقی رہیں گے اور اس امر کے کوئی آثار نہیں ملتے کہ ہمارے ملک یا ہمارے اتحادیوں کی ذمہ داریوں اور مفادات کو لاحق یہ خطرے دور ہو جائیں گے۔''*

امریکی فوجی انتظام پر اٹھنے والے بے پناہ خطرے کے نتیجے میں امریکی خارجہ پالیسی بھی عسکریت سے ہمکنار ہوتی چلی آئی ہے۔ خارجہ پالیسی میں عسکریت کی دو علامات بڑی واضح ہیں۔ اِن میں سے ایک دہشت گردی کے خلاف ختم نہ ہونے والی جنگ کا تصور

* یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سرد جنگ کے بعد امریکی اڈوں کی تعداد کم ہوئی ہے۔
* امریکی کانگریس کے بجٹ آفس کے مطابق 2013 تک امریکی فوجی بجٹ بڑھ کر 600 بلین ڈالر ہوجائے گا۔
* یہ دیکھ کر جارج آرویل کے ناول "1984" کی غیر مختتم جنگ یاد آجاتی ہے۔

MashalBooks.org

ہے اور دوسرا حفظِ ماتقدمی جنگ جس کا ذکر بش نے اپنی ویسٹ پوائنٹ کی تقریر میں کیا۔ اپنی 1999ء کی انتخابی مہم کی تقریر میں بش نے مستقل عسکریت کا تصور متعارف کروایا تھا:

''اگلی صدی میں ہماری فوج کو متحرک، مہلک اور کم از کم وقت میں مطلوبہ جگہ پر پہنچنے کا اہل ہونا چاہیے اور اس حوالے سے نقل و حمل کی ضروریات کو کم از کم کرنا ضروری ہے۔''

بش نے اپنی اسی تقریر میں کہا تھا، ''ہمیں اپنی قوت کو لمبے فاصلوں پر لگانے کا اہل ہونا چاہیے اور اس میں مہینوں کے بجائے دن اور ہفتے لگنا ضروری ہیں۔ ہماری فوج کو اہل ہونا چاہیے کہ اپنے ہدف کو کئی طرح کے ذرائع سے تلاش کر سکے اور ان اہداف کو فوراً ہتھیاروں کے ایک سلسلے کی مدد سے تباہ کر سکے۔''*

دائیں بازو کا صحافی چارلس کراتھیمر (Charles Krauthammer) امریکی خارجہ پالیسی میں عسکریت کا زبردست حامی ہے۔ اس نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے، ''امریکہ فقط بین الاقوامی شہری نہیں ہے۔ یہ دنیا کی ایک غالب قوت بھی ہے اور رومنوں کے بعد ایسے غلبے کی قوت نہیں گزری۔ چنانچہ امریکہ معیارات کو ایک نئی شکل دینے کا اہل ہو چکا ہے۔ کس طرح؟ اپنے ارادے کے اظہار میں کسی طرح کی معذرت خواہی یا لچک نہ دکھا کر۔''

اسی طرح کے خیالات کا اظہار ڈک چینی، رمز فیلڈ اور وولفو وٹز (Wolfo Witz) پر مشتمل ایک گروپ ''The Project for a New American Century'' نے عراق میں امریکہ کی فوجی موجودگی کے حوالے سے کیا ہے، ''ریاستہائے متحدہ کئی عشروں سے خلیج کی سلامتی میں ایک زیادہ مستقل کردار کا خواہاں چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ خلیج کے موجودہ تنازعہ نے ایک فوری جواز فراہم کر دیا تھا لیکن خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی صدام حسین حکومت کے مسئلے سے کہیں زیادہ بالاتر معاملہ ہے۔''

اسی طرح کا ایک تبصرہ مائیکل سٹول (Michael Stohl) نے بھی کیا: ''اگرچہ بڑی طاقت بھی دھمکی اور اکثر و بیشتر پر تشدد طریقے استعمال کرتی ہے لیکن قوت کے اس

* ایک بار مارک ٹوئن نے تبصرہ کیا تھا کہ جب آپ کے پاس اوزار کے نام پر صرف ہتھوڑا ہو تو تمام مسائل کیل نظر آنے لگتے ہیں۔

MashalBooks.org

استعمال کو دہشت گردی نہیں کہا جاسکتا اور یہ ایک دستور ہے۔''

پرنسٹن یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر رچرڈ فاک کا تبصرہ ہے، ''میکاوَلی سے نبر (Niebuhr) تک اور مارجنتھا (Morgenthau) سے کسنجر تک لوگوں کے ذہن میں ڈالا گیا ہے کہ اگر ہتھیار یا قوت کا کوئی حربہ ریاست اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کرتی ہے تو اسے تشدد نہیں کہا جائے گا۔ اس طرح کسی کی بے گناہی، انسانی مصائب پر غور وفکر یا ریاستی پالیسی کو محدود رکھنے کے معاملات کو غیر موزوں سمجھا گیا اور بنظر حقارت دیکھا گیا۔''

ریاستہائے متحدہ میں عسکریت کی اٹھان کے ساتھ ساتھ شہری آزادیوں پر بھی حملے ہونے لگے۔ ستر کے عشرے کے بعد سے امریکہ نے برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا کے تعاون سے الیکٹرانی نگرانی کا ایک بہت بڑا نظام چلایا اور اسے ایکلان (Echelon) کا نام دیا۔ اس پروگرام میں شامل تمام ریاستیں نگرانی کے اس نظام میں نہ صرف اپنے ملکی قوانین توڑتی ہیں بلکہ دوسرے ممالک کے اور بین الاقوامی قوانین کی بھی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ چونکہ نگرانی کے یہ طریقے انتہائی خفیہ ہیں چنانچہ اکثر انہیں روکا نہیں جاسکتا۔ اس پروگرام کے تحت ٹیلی فون سنے جاتے ہیں اور ای میلوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے سپر کمپیوٹر استعمال ہورہے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسے ادارے خاص طور پر اس پروگرام کی زد میں ہیں۔ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد امریکہ نے خود اپنے شہریوں پر نگرانی کو سخت کرنے کے لیے 25 اکتوبر کو کانگرس سے پیٹریاٹ ایکٹ پاس کروایا۔ اس طرح کی حرکتوں کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ یوں حاصل ہونے والی معلومات کو استعمال کرتے ہوئے کوئی بھی حکومت اپنے اقتدار کو طوالت دے سکتی ہے۔

برطانوی مصنف نیال فرگوسن (Niall Ferguson) نے امریکی سلطنت کے برطانوی اور رومن سلطنتوں کے ساتھ تقابل پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ مصنف بھی سمجھتا ہے کہ سلطنت کا بجائے خود برا ہونا ضروری نہیں اور آج اگر کوئی سلطنت موجود ہے تو وہ فقط امریکہ ہے۔ وہ قرار دیتا ہے کہ امریکی عالمی غلبہ دنیا کے لیے بہتر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم آج امریکی عہد میں زندہ ہیں۔

اس میں کیا برائی ہے۔ اگر امریکی عالمی حکومت بننا چاہتے ہیں تو انہیں کیوں بننے

MashalBooks.org

دیا جائے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی عالمی حکومت جس کی بنیاد عالمی جمہوری اصولوں کے بجائے فوجی حکومت پر ہے اسے ظلم کہا جائے گا۔ مزید یہ کہ کیا کسی بھی ایک ملک کو بین الاقوامی مسائل کا معروضی ادراک ہوسکتا ہے؟ مثال کے طور پر اسلامی دنیا کہتی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی منصفانہ نہیں۔ درحقیقت 11 ستمبر کے حملوں کی بڑی وجہ بھی اسرائیل کی طرف غیر منصفانہ امریکی جھکاؤ ہے۔ اور پھر امریکی خارجہ پالیسی میں بڑھتی ہوئی عسکریت بھی امریکی بالادستی کو مثبت تصور نہیں رہنے دیتی۔

امریکہ کا اصرار ہے کہ وہ پوری دنیا میں جمہوریت کے اصول پھیلانے کا عزم رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بجائے خود یہ خیال ہی غیر جمہوری ہے۔ کیا یہ غیر جمہوری نہیں کہ عسکری بل بوتے پر غیر منصفانہ اقتصادی تعلقات مسلط کئے جائیں اور پھر تیسری دنیا کی غربت کی قیمت پر بے پناہ دولت کے انبار لگا دیئے جائیں؟ نیو یارک میں تین ہزار لوگ دہشت گردی کے حملے میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن یہ المیہ عراق میں ہلاک ہونے والے لاکھوں لوگوں کی موت سے زیادہ المناک کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر عراق پر پابندیاں نہ لگائی جاتیں تو بے شمار لوگوں کو مرنے سے بچایا جا سکتا تھا۔

ہم میں سے بہت سے لوگ ریاستہائے متحدہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کی وجہ امریکی لوگوں کی اپنے آدرشوں سے لگن، فراخ دلی اور توانائی کے ساتھ ساتھ روشن خیالی پر مبنی امریکی طرزِ زندگی کے اصول ہیں۔ لیکن امریکہ کے ساتھ محبت کرنے والے لوگوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کے اندر عسکریت پسندی کینسر کی طرح پنپ رہی ہے اور یہ وہی عسکریت پسندی ہے جس کے خلاف امریکی صدر آئزن ہاور نے اپنے ابتدائی خطاب میں خبردار کیا تھا۔

MashalBooks.org

9

تعلیم برائے امن

عالمی شہریت کی تعلیم

انسانیت، جمہوریت اور منصفانہ نظام پر مبنی بین الاقوامی قانون اور نظام حکومت کے علاوہ ہمیں عالمی اخلاقیات کی بھی فوری ضرورت ہے۔ اس عالمی اخلاقیات میں خاندان، کمیونٹی اور قوم کے ساتھ محبت کی تکمیل کے لیے انسانی بھائی چارے کے احساس کو بھی شامل کیا جائے گا۔ یعنی لوگوں کو بتایا جائے گا کہ مذہب، نسل اور قومیت سے ارفع تر ایک اور تعلق بھی انسانوں کے مابین موجود ہے۔

بالخصوص تاریخ کی تدریس کے حوالے سے اصلاحات کی فوری ضرورت موجود ہے۔ جو تاریخ ہمیں آج پڑھائی جاتی ہے وہ صرف قوت کے حصول کی کشمکش اور اس کے نتیجے میں ہونے والی جنگوں کے احوال ہیں۔ اس طرح کی تاریخ میں سے قومیتی تعصّبات کبھی نکالے نہیں گئے اور نہ ہی اس طرح کی کوشش کی گئی۔ ہر ملک میں بتایا جاتا ہے کہ صرف ہمارا مذہب یا نسل ہی ارفع تر ہے اور صرف ہمارا ملک اور ہیرو ہی راستی پر ہے۔

اس امر کی فوری ضرورت موجود ہے کہ انسانی تمدن کے ارتقاء کا حال بیان کیا جائے اور اس حوالے سے ہر خطے میں بسنے والے انسانوں کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ ہماری آج کی تہذیب کے لیے ماضی کی کئی اہم تہذیبوں نے بنیاد فراہم کی تھی جس

MashalBooks.org

میں جاپان، ہندوستان، میسوپوٹیمیا، مصر، یونان، اسلامی دنیا، مسیحی یورپ اور یہودی علمی روایت سب شامل ہیں۔

آلو، مکئی، وینیلا، چاکلیٹ، کالی مرچ، انناس اور کونین امریکی انڈینوں کے تحفے ہیں۔ انسانی تمدن کی تشکیل میں لاکھوں، کروڑوں لوگوں کی جسمانی وذہنی محنت شامل ہے۔ یہ اتنا قیمتی ورثہ ہے کہ اسے کسی صورت میں نیوکلیائی جنگ کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

تاریخ کی تدریس کے دوران ایسے ادوار اور مقامات پر توجہ دینا چاہیے جہاں اچھی حکومت اور داخلی امن کو ممکن بنایا گیا تھا۔ دنیا کو زیادہ بہتر جگہ بنانے کے طریقے سوچنے میں طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ خاص طور پر کامیاب فیڈریشنوں کی تاریخ کا مطالعہ سودمند رہے گا۔

بالآخر آسٹریلیا، برازیل، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، امریکہ اور کینیڈا کامیاب فیڈریشنیں ہیں۔ یورپی یونین اس کی ایک تازہ ترین مثال ہے۔ کامیابیوں کے ساتھ ساتھ فیڈریشن کے مسائل کا مطالعہ بھی ہونا چاہیے * کہ کس طرح فیصلہ سازی کے عمل میں بنیادی اکائیوں کو نظر انداز کرنے پر فیڈریشن ناکام ہوسکتی ہے۔*

اقتصادیات اور کاروبار کی تدریس میں بھی اصلاح ہونی چاہیے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کلاسیکی اقتصاد متشکل ہوا۔ تب لگتا تھا کہ دنیا میں خام مال اور زمین بہت لمبا عرصہ چلے گی۔ تب سرمائے کی کمی اقتصادی ترقی کی واحد رکاوٹ تھی۔ تمام ماہر اقتصادیات فقط ترقی پر زور دے رہے تھے۔ اس زمانے کو کھلی دنیا کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے آج کی دنیا مقابلتاً بند دنیا ہے۔ ترقی کے امکانات روز بروز کم ہو رہے ہیں۔ اب مسئلہ سرمائے کی کمی کا نہیں بلکہ کم ہوتی قابل کاشت زمین، پانی اور ان وسائل کا ہے جن کی تجدید نہیں ہوسکتی۔ اس کے باوجود اقتصاددان کلاسیکی خطوط پر ترقی کا راگ الاپ رہے ہیں۔ ہمیں

* Subsidiarity کا اصول بتاتا ہے کہ فیڈریشن کے اندر فیصلے اتنی نچلی سطح پر ہونا ضروری ہیں کہ وہ کسی اہم بیرونی عنصر سے متاثر نہ ہوں۔ مثال کے طور پر یورپ کے اندر ہوا کی کوالٹی سے تعلق رکھنے والے فیصلوں کا برسلز میں ہونا مناسب ہے کیونکہ ہوائیں قومی سرحدوں کو پھلانگتی ہیں۔ لیکن مقامی ماحول پر اثرانداز ہونے والے فیصلوں کا مقامی سطح پر ہونا ضروری ہے۔

* ان خصائص میں سے اہم ترین یہ ہے کہ فیڈریشن کے پاس قوانین بنانے اور افراد پر عائد کرنے کی قوت ہونی چاہیے۔ یعنی فیڈریشن کا عمل دخل فقط حکومتوں کی گوشمالی تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔

MashalBooks.org

چاہیے کہ اقتصاددانوں کو فوری طور پر حیاتیات اور ماحولیات کی تعلیم دیں۔ ترقی کے اقتصاد کا زمانہ گزر گیا۔ ہمیں ماحولیات، گنجائش اور استقرار کو مناسب اہمیت دیتے ہوئے توازن کی اقتصاد کو ترقی دینا ہوگی۔ ہمیں اپنے آج کے ساتھ ساتھ آنے والے کل کو بھی دیکھنا ہوگا۔

ماہرین اقتصاد کی تعلیم میں جنوب کے علاقوں کی خوفناک غربت اور شمال کے علاقوں کی افراط کے فرق کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ کاروبار اور اقتصاد کے طالب علموں کو غربت کی وجوہات محض بڑھتی آبادی اور جنگ میں تلاش کرنے کی بجائے نوآبادیاتی اور نیو نوآبادیاتی تاریخ میں بھی تلاش کرنا ہوں گے۔ اس تلاش میں عالمی اقتصادی اداروں اور تجارتی معاہدوں کے نقائص بھی دیکھنا ہوں گے۔ جنگ اور جنگ کی تیاری کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جنگ کے براہ راست وبالواسطہ اخراجات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ آبادی کے استقرار کا مسئلہ بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ خوراک، قابل کاشت زمین کا زیاں، مستقبل کے توانائی کے بحران، کم ہوتے توانائی کے ناقابل تجدید ذرائع وغیرہ سب قابل غور مسائل ہیں۔ ماہرین کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جنگی صنعت کو پر امن صنعت میں کس طرح بدلا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ہماری آج کی اقتصادیات جنگ کے گرد گھومتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو کسی طرح بھی کوئی صحت مند علامت نہیں اور یہ نشہ آور دواؤں پر انحصار کرنے والی بات؛ ان نکات کو ماہر اقتصادیات کی تعلیم میں مناسب جگہ ملنی چاہیے۔

قانون کے طالب علموں کو بین الاقوامی قانون کی اہمیت سے آگاہ ہونا چاہیے۔ انہیں اس قانون کی تاریخ پڑھائی جائے اور بتایا جائے کہ یہ کس طرح بحری قوانین سے شروع ہوئے۔

انہیں انصاف کی بین الاقوامی عدالت اور نورمبرگ اصولوں کی تاریخ پڑھائی جائے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر، انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلامیے اور بین الاقوامی فوجداری عدالت کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ قانون کے طالب علموں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ اقوام متحدہ کے موجودہ نظام میں کون سی خامیاں ہیں اور کس طرح کی قانون سازی کے ذریعے افراد کو اس طرح کے قانون کا پابند بنایا جاسکتا ہے۔

قانون کے طالب علم کو پتہ ہونا چاہیے۔ کہ عالمی عدالت نے نیوکلیائی ہتھیاروں پر پابندی عائد کرتے ہوئے انہیں غیر قانونی قرار دیا تھا۔ انہیں ہیگ اور جنیوا کنونشن سمیت

MashalBooks.org

نیوکلیائی، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے متعلق بین الاقوامی معاہدے پڑھائے جائیں۔ انہیں بتایا جائے کہ یورپی یونین کے قوانین اور ان کی رکن ریاستوں کے قوانین کے مابین کس طرح کا تعلق موجود ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے اس فیصلے کو بھی نصاب میں شامل کیا جائے کہ یورپی یونین کے قوانین کو برطانوی قانون پر فوقیت ملنی چاہیے۔

اسی طرح الٰہیات کے پروفیسر مذہبی اخلاقیات پڑھاتے ہوئے محبت، رواداری، عالمی انسانی بھائی چارے اور ہلاکت سے گریز کا درس دیں۔ الٰہیات کے طالب علم کو بتایا جائے کہ وہ مذاہب کے مابین مفاہمت کو ترویج دے اور نسلوں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلق کو آسان بنائے۔

سائنس کی تعلیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ سائنس اور انجینئرنگ کے طالب علموں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ وہ ہتھیار سازی کی صنعتوں سے وابستہ نہ ہوں اور نہ ہی ایسے پیداواری طریقوں میں ملوث ہوں جن کا ماحولیات پر منفی اثر پڑتا ہے۔ ان طالب علموں کے لیے تاریخ اور سائنس کے سماجی اثرات کا مطالعہ ضروری ہے۔ انہیں سائنسی خیالات کی تاریخ پر مبنی ایک کورس پڑھایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ بتایا جائے کہ صنعتی انقلاب، آبادی کے عالمی دھماکے، نیوکلیائی ہتھیار، جینیاتی انجینئرنگ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی باہم غیر متعلق نہیں ہیں۔ انہیں آگاہ کیا جائے کہ چونکہ ان کا کام نوع انسان کی عمومی فلاح پر براہِ راست اثرانداز ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں اپنی سماجی و اخلاقیاتی ذمہ داری سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح کی تعلیم کے بغیر سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کو معاشرے کے لیے مفید بنانا مشکل ہے۔

مذکورہ بالا تربیتی پروگراموں کا تعلق یونیورسٹی سے تھا۔ بنیادی تعلیم کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آسان زبان اور روزمرہ تجربے کے تناظر میں بچوں کو جنگ اور امن کے متعلق بنیادی حقائق ذہن نشیں کروائے جائیں۔* اساتذہ کی تربیت میں ان پر واضح کیا جائے کہ وہ اپنے اثر ورسوخ کو امن کی ترویج میں کس طرح استعمال کرسکتے ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ مختلف عمروں کے بچوں میں بے جا پریشانی پیدا کئے بغیر امن کی ضرورت اور اہمیت سے روشناس کرائیں۔

* جنگ کا وجود فقط منفی عمل ہے۔ جب ریاستیں انسانی فلاح کے منصوبے پر باہم متفق ومتعاون ہوتی ہیں تو یہ حالت مثبت امن کہلائے گی۔ اس تعاون میں ثقافتی وتجارتی تعلقات بھی شامل ہیں۔

MashalBooks.org

یونیسکو اور امن کا کلچر

امن کے لیے تعلیم کے استعمال کی وکالت کرنے والوں کو یونیسکو کی مثال سے حوصلہ پکڑنا چاہیے۔ اقوام متحدہ کے اس ادارے کا آئین دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد لکھا گیا۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد بالخصوص ہٹلر کے جرمنی میں طالب علموں کو اس بات کی تعلیم دی گئی کہ جس سے وہ فوجی آمریت کے حامی بنے اور برے اور بھلے کی پرکھ سے بے گانہ ہو گئے۔ اقوام متحدہ کے بانی تعلیم کے اس غلط استعمال کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ امن کے لیے تعلیم کے استعمال کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یونیسکو کے آئین کا یہ پیرا مفید ثابت ہوسکتا ہے:

''تنظیم کا مقصد ہے کہ امن اور سلامتی کے لیے قوموں کے مابین تعلیم، سائنس اور ثقافت کو استعمال کیا جائے تا کہ عدل، قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے لیے توقیر کا جذبہ پیدا ہو۔ اسی طرح نسل، جنس، زبان یا مذاہب کی تخصیص کئے بغیر اقوام متحدہ کے چارٹر پر عمل ہوسکتا ہے۔'' دوسرے الفاظ میں یونیسکو نے تعلیم میں بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ امن اور فروغ امن کی ترویج بذریعہ تعلیم کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

1946ء میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں 39 نکات پر مبنی ایک قرارداد منظور کی گئی جس کا تعلق درسی کتابوں میں اس طرح کی تبدیلیوں سے تھا کہ انہیں بین الاقوامی مفاہمت اور شہریات کی تعلیم میں استعمال کیا جاسکے۔ اگلے عشرے میں یونیسکو نے تاریخ، جغرافیہ اور جدید زبانوں کی تدریس میں بہتری کے لیے سیمینار منعقد کروائے اور کتابیں شائع کروائیں تا کہ انہیں اقوام اور تمدنوں کے مابین باہمی مفاہمت کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ درسی کتابوں میں سے قومی تعصّبات نکلوانے کے لیے 1952ء میں فرانسیسی، جرمن، برطانوی، اور امریکی استادوں کی میٹنگ منعقد کی گئی۔ اس کے بعد سے ہر دو سال بعد یونیسکو کی سرپرستی میں تاریخ کے اساتذہ دوطرفہ اور کثیر فریقی مشاورت کے لیے اجلاس منعقد کرتے چلے آرہے ہیں۔ پچھلے سالوں میں یونیسکو کے اغراض ومقاصد کے حوالے سے کچھ لوگوں کے خیالات یوں ہیں:

1) برطانیہ کی سابق وزیر تعلیم اور 1945ء میں یونیسکو کانفرنس کی چیئر وومن ایلن ولکنسن کا کہنا ہے، ''یہ ادارہ کیا کرسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ قومیت پر مبنی

تدریس کی جگہ انسانیت کا تصور متعارف کروایا جائے تا کہ بچوں میں اپنی قومیت کے ساتھ ساتھ اپنے انسان ہونے کا احساس بھی اجاگر ہو؟ اس مقصد کے لیے کام کرنا گویا بین الاقوامی مفاہمت کے لیے کام کرنا ہے۔''

2) جدید تعلیم اور تعلیم برائے امن کی بانی اٹلی کی ماریا مونٹیسوری نے یونیسکو کی جنرل کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں کہا ''اگر کسی دن یونیسکو دنیا کی تعمیر نو اور امن سازی میں بچوں کو ساتھ ملاتی ہے، ان کے ساتھ بات کرتی ہے اور ان کی اہلیت کی قدر و قیمت کو مان لیتی ہے تو پھر ہمیں معاشرے میں ایک نئی روح پھونکنے میں ان سے بے پناہ مدد ملے گی۔''

3) میکسیکو کے جیمی ٹورس اور 1951ء میں یونیسکو کوریئر کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے، ''انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے اور ان کے عملی اطلاقات کا علم اور فہم بچپن سے دیا جائے۔ جب تک دنیا بھر کے سکول ان اصولوں کو اپنے نصاب کا حصہ نہیں بناتے لوگوں کو نہ تو اپنے حقوق و فرائض کا پتہ چلے گا اور نہ ہی ان کے مضمرات کا۔''

4) 1950ء تا 1956ء یونیسکو کے محکمہ تعلیم کی ڈائریکٹر برطانیہ کی لائیونل ایلون نے کہا، ''اگر یونیسکو پیرس میں موجود صرف ایک دفتر ہے تو اس کا کام ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ایسے پینسٹھ ممالک کی تنظیم ہے جنہوں نے عہد کیا ہے کہ وہ نہ صرف بین الاقوامی سطح پر بلکہ اپنے اپنے ملک کے اندر بھی امن بذریعہ تعلیم کے لیے کام کریں گے۔ اگر ہمیں یہ کام تیزی سے اور بہتر طور پر کرنا ہے تو اس کے بین الاقوامی پہلو کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

5) 1947ء سے 1964ء تک وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہنے والے جواہر لعل نہرو نے 1962ء میں یونیسکو کے ایک دورے کے موقعہ پر کہا: ''باہمی افہام و تفہیم، علم، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے اور ایسے ہی دیگر مقاصد کے لیے انسانوں کے ذہنوں اور دلوں کو بدلنا ہوگا۔ اور یہ کام مناسب تعلیم کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔''

فیڈریکو میئر زار گوسا نے یونیسکو کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کلچر برائے امن کا

تصور متعارف کروایا تھا۔ دیگر بہت سے لوگوں کی طرح اس کا بھی ایقان تھا کہ تہذیب ایک بحران میں داخل ہونے کو ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بحران اقتصادی اور سیاسی کے ساتھ ساتھ روحانی بھی ہے۔ وہ اس امر کا بھی حامی تھا کہ ہمیں امن کو اخلاقیاتی اور جمالیاتی اقدار، عادات ورسوم کا حصہ بنانا چاہیے اور یہ امر دوسروں کے ساتھ معاملے اور رویہ میں جھلکنا بھی ضروری ہے:

1۔افراد کے انسانی حقوق، وقار اور حیات کا احترام۔

2۔تشدد کا استرداد۔

3۔عورتوں اور اور مردوں کے حقوق کا مساوی ہونا۔

4۔جمہوریت، آزادی، عدل، رواداری، وحدت اور اختلاف کا احترام۔

5۔ممالک، اقوام اور نسلی، مذہبی، ثقافتی اور سماجی گروہوں؛ کے مابین مفاہمت۔

یونیسکو نے مذکورہ بالا خیالات کی ترویج کے لیے سال 2000 ء کو کلچر برائے امن کا سال قرار دیا۔اس سال کی تیاری کے لیے نوبیل امن انعام یافتگان کے ایک اجلاس میں مینی فیسٹو 2000 ء پیش کیا گیا۔ انہوں نے قرار دیا کہ ''میں مانتا ہوں کہ مستقبل کی انسانیت اور بالخصوص آج کے بچوں کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریاں میرے حصے میں بھی آتی ہیں۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اپنے خاندان، کام، ملک، کمیونٹی اور مذہب جیسے معاملات میں:

1) بلاتمیز وتعصب ہر شخص کی زندگی اور وقار کا احترام کروں گا۔

2) تشدد کی ہر شکل کو مسترد کرتے ہوئے عدم تشدد پر عمل پیرا رہوں گا۔ جسمانی، جنسی، نفسیاتی، اقتصادی اور معاشرتی سطح پر بالخصوص بچوں اور نوعمروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اس رویہ سے بچوں گا۔

3) ناانصافی، عدم رواداری اور سیاسی واقتصادی جبر ختم کرنے کے لیے اپنا وقت اور مادی وسائل بڑی فراخ دلی کے ساتھ استعمال کروں گا۔

4) آزادئ اظہار اور ثقافتی تنوّع کا دفاع کروں گا اور عدم رواداری اور انتہا پسندی سے گریزاں ہوتے ہوئے مکالمے اور سننے کی حکمت عملی اپناؤں گا۔

5) بطور صارف خیال رکھوں گا کہ حیات کی تمام اقسام اور قدرتی ماحول کی بقا کی نفی نہ

ہونے پائے۔

6) کوشش کروں گا کہ میری کمیونٹی کی ترقی میں عورتوں کی شراکت کے ساتھ جمہوری اصول فروغ پائیں اور یوں وحدت کی نئی شکل سامنے آئے۔

فیڈریکو میٹر کی کوششوں سے یونیسکو نے چلڈرن آف دی ورلڈ کے نام سے ایک مہم چلائی جو دنیا بھر کے بچوں کے لیے امن اور عدم تشدد کے کلچر کی ترویج کے عشرے کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کام میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی تعاون کیا۔ کلچر برائے امن کے پروگرام میں دستخط کنندگان سے مطالبہ کیا گیا کہ بچوں کی تعلیم میں اس امر کا خیال رکھا جائے کہ انہیں امن کی ضرورت اور انسانی وقار کے حوالے سے ضروری اقدار اور رویے بتائے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں رواداری اور عدم امتیاز کا سبق بھی مل رہا ہے۔

ابھی اس پروگرام کا آغاز ہی ہو پایا تھا کہ 11 ستمبر کے حملے ہو گئے۔ جنگ اور تشدد کے کلچر کو ہوا ملی اور کلچر برائے امن کے پروگرام کو دھچکا لگا۔ خیال رکھا جائے کہ مسائل کے عسکری حل طاقت ور ترین ممالک کو بھی حقیقی سلامتی فراہم نہیں کرتے۔ اعلیٰ معیار کے اور مہنگے فوجی نظاموں کا فائدہ صرف ہتھیار ساز اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اس طرح کے نظام سلامتی کی ضمانت فراہم نہیں کرتے۔ مستقبل کی امید صرف امن کے ساتھ وابستہ کی جا سکتی ہے۔

ڈنمارک میں امن کی تعلیم کی کچھ مثالیں

یونیسکو کی ڈینش کمیٹی سے وابستہ نیلز ہاٹ مان نے ابتدائی سطح پر بچوں کو امن کی اہمیت سے روشناس کروانے کے لیے "A Child Needs Peace" نامی ایک کتاب لکھی جس کے کچھ پیرے یوں ہیں:

امن اور وحدت

دنیا میں وسائل کی زیادہ منصفانہ تقسیم متقاضی ہے کہ ہم اپنے اپنے ممالک کے اندر رہتے ہوئے بھی کم ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کے ساتھ وحدت محسوس کریں۔ ہماری اور ان کی بہت سی چیزیں مشترکہ ہیں۔ دوسروں کے ساتھ وحدت محسوس کرنے والے لڑتے نہیں بلکہ دوستی محسوس کرتے ہیں۔ وحدت کا مطلب ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے محض قربانی دینے سے زیادہ بھی کچھ کریں۔ اگر ہم دوسرے لوگوں کو فقط وہی کچھ دیتے ہیں جو

ہمارے پاس ضرورت سے بہت زیادہ ہے تو بھی کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ سچی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام کریں۔ تمدن، مذہب اور زندگی کا احترام سب اس میں آجاتے ہیں۔ جب ہم ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں تو باہم کھل جاتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے سیکھنا ہے۔

امن اور بنیادی ضرورتیں

جب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں تو وہ خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں اور لڑائی جھگڑے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات اس طرح پوری کرے کہ کسی دوسرے کا استحصال نہ ہو۔

1) اگر میں خود کو محفوظ تر محسوس کرنے کے لیے ہتھیار خریدتا ہوں تو کچھ لوگوں کو خطرہ ضرور محسوس ہوگا۔

2) اگر میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کسی کا استحصال کرتا ہوں تو بے چینی اور اختلاف ضرور جنم لے گا۔

3) اگر میں اپنی ضرورت سے زیادہ خوراک استعمال کرتا ہوں تو دوسرے بھوکے رہ جائیں گے۔

4) اگر میں ایک کنواں کھودنے کے بعد سارے پانی پر تسلط کر لیتا ہوں تو دوسرے پیاسے رہ جائیں گے۔

5) اگر میں غیر ضروری چیزیں خریدتا ہوں تو دوسروں کے پاس ضروری چیزوں کی بھی قلت ہو جائے گی۔

ہتھیاروں پر ضائع ہونے والی رقم کے مناسب استعمال

1985ء میں دنیا بھر میں عسکری مقاصد کے لیے آٹھ ہزار بلین کرونے* استعمال ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی دیر یہ سبق پڑھتے ہوئے گزری کوئی نصف بلین کرونے فوجوں پر استعمال ہو چکے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ پوری رقم کے اس چھوٹے سے

* جب نلز ہارٹ مان کی کتاب لکھی گئی تو ڈنمارک کے آٹھ کرونا ایک ڈالر کے برابر تھے۔

MashalBooks.org

حصے کی مدد سے اور کیا کچھ ہوسکتا تھا۔

صحت

دنیا میں تقریباً ہر کہیں ڈاکٹروں، نرسوں اور ہسپتالوں کی کمی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے غریب اضلاع اور کچی آبادیوں میں یہ کمی واقعی بہت زیادہ ہے۔ وہاں بے شمار ایسی بیماریوں کے خلاف ابھی تک مدافعتی ٹیکے نہیں لگے جو ہمارے ملک سے ختم ہو چکی ہیں۔ خسرے, کالی، کھانسی، خناق، تپ دق، پولیو اور تشنج کے ہاتھوں ہر سال ملینوں بچے مرجاتے ہیں۔ بہت سے بچے ایسے ہیں کہ انہیں بیماری میں دوا اور ضروری وٹامن نہیں ملتے۔ صحت کی بنیادی سہولتیں فراہم کر دی جائیں تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ پوری دنیا میں صحت کا بنیادی نظام قائم کرنے کے لیے سالانہ 17 بلین کرونے کافی ہوں گے۔

پینے کا پانی

دنیا میں دو بلین لوگوں کے پاس پینے کا صاف پانی موجود نہیں۔ اس کے نتیجے میں کئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ آج ترقی پذیر ممالک میں بچپن کی موت کی ایک بڑی وجہ پیچش ہے۔ اقوام متحدہ نے 1981ء تا 1990ء کو پانی کا عشرہ قرار دیا تھا۔ اقوام متحدہ کا تخمینہ ہے کہ کل 50 بلین کرونے کے خرچ سے پوری دنیا کے لوگوں کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم

ترقی پذیر ممالک میں نصف سے بھی کم بالغ ایسے ہیں جو کبھی سکول کا منہ دیکھ چکے ہیں۔ مثبت ترقی اور جدید معاشرے کے لیے تعلیم بہترین سرمایہ کاری ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں سکول تعمیر کرنے، ان کے اساتذہ کو تنخواہیں دینے اور تعلیمی سامان مہیا کرنے پر کل 55 بلین کرونے کا خرچ اٹھتا ہے۔

نیلنر کی اس کتاب پر ترقی پذیر ممالک کے دو بچوں کی تصویریں بنی ہیں۔ اس کی

MashalBooks.org

زبان سادہ ہے اور بچوں کو مثالیں دے کر امن کی ضرورت ذہن نشین کروائی گئی ہے۔ ڈنمارک نے کئی سالوں سے بچوں کو خالص مسابقتی رویے اور مبنی تعاون رویے و عادات دینے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اس نظام میں ایسے منصوبوں پر توجہ دی جاتی ہے جہاں انفرادی کی بجائے اشتراک کی بنیادوں پر کام ہوتا ہے۔ اسے بالواسطہ امن کی تعلیم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یو نیورسٹی کی سطح پر بھی ڈنمارک کا نظام تعلیم اسی طرح کا ہے کہ منصوبے مبنی برتعاون دیئے جائیں۔

ڈنمارک کے نظام تعلیم کی ایک اور انفرادیت کوئی سو سکولوں میں دستیاب تعلیم بالغاں کا نظام ہے۔ ڈنمارک میں تعلیم بالغاں کی روایت بہت دور اٹھارہویں صدی تک چلی جاتی ہے۔ یہ پروگرام سب سے پہلے ڈنمارک کے شاعر بشپ گرینڈوک نے شروع کیا تھا۔

گرینڈوک (1783-1872) نے اپنا پروگرام شروع کیا تو صنعتی انقلاب اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔ تب انگلینڈ برآمدات کرنے لگا تھا لیکن کثیر آبادی کے سبب خوراک میں خود کفیل نہیں تھا۔ تب ڈنمارک نے برطانیہ کو سامان خورونوش کی برآمد شروع کردی۔ گرینڈوک کے سکول سے فارغ ہونے والے کسانوں نے ادراک کر لیا کہ اگر وہ اپنی ضروریات سے زیادہ سامان کسی آڑھتی یا بڑے زمیندار کو بیچتے ہیں تو انہیں گھاٹا رہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مل کر کوآپریٹیو سوسائٹیاں بنائیں۔ گرینڈوک ہائی سکول نے انہیں مطلوبہ مہارت اور اعتماد فراہم کیا۔ ان باہمی تعاون کی بنیاد پر چلنے والی سوسائٹیوں نے ڈنمارک کو خوشحال اور جمہوری ملک بننے میں بنیادی مدد فراہم کی۔ ڈنمارک میں آج سو سے زیادہ گرینڈوک ہائی سکول موجود ہیں۔ گرما 1985ء میں ایلزی نور کے انٹرنیشنل کالج میں عدم تشدد پر مبنی معاشرے کے حصول پر دو ہفتے کا ایک کورس کروایا گیا۔ دنیا کے تقریباً ہر حصے کے لوگ لیکچر دینے وہاں پہنچے۔ چونکہ طالب علموں کی فیسوں کے علاوہ ادارے کو سرکاری مالی معاونت بھی حاصل تھی چنانچہ آنے والوں کو سفر اور طعام وقیام کا خرچہ بھی دیا گیا۔ سوائے سیٹسن کے اقوام متحدہ کے منشور پر دستخط کرنے والے تمام لوگ مر چکے ہیں۔ یہاں گاندھی اور اس کے عدم تشدد پر ایک ماہر خصوصی ڈاکٹر سمن کھنہ نے بھی لیکچر دیا۔ مشرق وسطیٰ سے آنے والی مندوب سسٹر جارج نے مشرق وسطیٰ کے تنازعہ پر روشنی ڈالی۔ یہاں ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسے بین الاقوامی اداروں کے مندوب بھی بطور لیکچر موجود تھے۔

MashalBooks.org

اس کے بعد سے امن کا یہ سمر سکول باقاعدگی سے منعقد کیا جارہا ہے۔ اس میں سکینڈے نیویا کے دوسرے حصوں اور بقیہ یورپ سے آنے والے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان نئی دوستیاں بنتی ہیں اور یوں یہ کورس علمی کے ساتھ ساتھ سماجی پلیٹ فارم بھی مہیا کرتا ہے۔ سمن کھنہ نے عدم تشدد کی گاندھی کی روایت کے علاوہ یہاں یوگا پر بھی لیکچر دیئے۔

ڈنمارک کی پارلیمنٹ کی ایک رکن میٹاڈٹزل (Meta Ditzel) پر تشدد ویڈیو کی خوف ناکی پر لیکچر دیتی چلی آرہی ہے۔ اس نے ویڈیو کی ایک دکان پر پہنچ کر تشدد کی بدترین فلم کا پوچھا اور بتایا کہ وہ اسے ایسی فلموں پر پابندی کے لیے ایک مہم میں استعمال کرنا چاہتی ہے۔ دکان کے مالک نے اپنا روزگار خطرے میں دیکھا تو اسے ایک معصوم سی فلم تھمادی۔ ڈٹزل نے اسے پہلے دیکھے بغیر چلادیا اور یوں اس کا لیکچر کم موثر رہا۔

ڈنمارک کا نظام تعلیم ایک اور منفرد خاصیت سے متعارف کروانے کو ہے۔ خزاں 2004ء کے بعد سے ڈنمارک میں یونیورسٹی کی سطح کے سائنس اور انجینئرنگ کے تمام طلبہ کو فلسفۂ سائنس اور اس کے اخلاقیاتی پہلو پر ایک کورس کرنا پڑے گا۔ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ پڑھائی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ کہاں اس کے نتائج مفید اور کہاں ضرررساں نکلے۔ سائنس کے ساتھ متعلقہ مسائل بھی نصاب کا حصہ ہوں گے۔ یہ تمام مثالیں ڈنمارک کے نظام تعلیم سے دی جارہی ہیں جس کے ساتھ میری قدرے شناسائی ہے۔ امن کی تعلیم کے حوالے سے ڈنمارک سکینڈے نیویا میں ایک ممتاز ملک ہے۔ تاہم یورپ، شمالی امریکہ اور لاطینی امریکہ میں بھی امن کی روایات موجود ہیں۔

ابلاغ کا جائز و ناجائز استعمال

ذرائع ابلاغ اور جنگ کے درمیان موجود تعلق کے حوالے سے اخباری صنعت کے ایک موثر شخص ولیم رینڈالف ہرسٹ کا واقعہ خاصا چشم کشا ہے۔ جب ایک دھماکے کے نتیجے میں امریکی بحری جہاز یو ایس ایس مین ہوانا کی گودی میں ڈوب گیا تو ہرسٹ نے پیش بینی (اور خواہش) کی کہ شائد امریکہ اور سپین کے درمیان جنگ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے بہترین مصور فریڈرک رمنگٹن کو مناظر کشی کے لیے ہوانا بھجوا دیا۔ ہوانا میں کچھ روز قیام

MashalBooks.org

کے بعد رمنگٹن نے تار دی، ''یہاں سب خاموشی ہے۔ کوئی جنگ نہیں ہو رہی۔'' ہرسٹ نے جوابی تار دی ''مجھے تصویریں بھجواؤ۔ میں جنگ بھجواتا ہوں۔'' ہرسٹ سچا تھا۔ اس کے اخباروں نے امریکی رائے عامہ کو اتنا بھڑکایا کہ سپین-امریکہ جنگ ناگزیر ہوگئی۔ جنگ کے دوران ہرسٹ نے بہت سے اخبار بیچے اور رمنگٹن نے بہت سی تصاویر۔ کہانی سے واضح پتہ چلتا ہے کہ اخبار جنگ پر پلتے ہیں اور جنگ اخبارات پر۔ قوم پرستی کے باب میں ہم نے بتایا تھا کہ یورپ میں قوم پرستی کی ترویج میں اخبارات کا بڑا ہاتھ ہے۔ اخبار بینی کا دور عام ہونے سے پہلے زیادہ تر لٹنے والے بھاڑے کے فوجی تھے۔ انہیں سوسائٹی کے کم ترین طبقے سے بھرتی کیا جاتا اور وہ صرف مال کے لالچ میں چلے آتے۔ بالعموم جذباتی سطح پر عام لوگ لا تعلق رہتے۔ تاہم انقلاب فرانس اور اخبارات نے یہ صورت حال بدل دی اور بہت جلد جنگ جذباتی معاملہ بن گیا۔ ذرائع ابلاغ نے لوگوں کے اندر کمیونٹی کے دفاع کے ان جذبات کو ابھارا جنہیں کونرڈ قبیلے کے دفاع میں اپنی قربانی دینے کا جذبہ کہا کرتا تھا۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا ظہور ہوا تو ذرائع ابلاغ مزید موثر ہو گئے۔ دنیا بھر کے سیاست دانوں نے بھی بھانپ لیا کہ جدید دنیا میں ذرائع ابلاغ اقتدار کی کنجی ہیں۔ مثال کے طور پر ہٹلر پروپیگنڈے کی قوت اچھی طرح جانتا تھا اور اس نے اسے خوب برتا۔ آج بھی ریاست یا سرمائے کی رہنمائی میں چلنے والے اخبار، ریڈیو یا ٹیلی ویژن عوامی رائے کو حکومت کے حق میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ یہ امر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر 2003ء میں عراق پر حملے کے دوران واقعات کا سرکاری موقف سی این این پر دکھایا گیا جبکہ ان پر تنقید تقریباً بند کر دی گئی۔

پچاس کے عشرے کے وسط میں ٹیلی ویژن صنعتی دنیا کے تقریباً ہر گھر میں پہنچ چکا تھا۔ ٹیلی ویژن بصارت اور سماعت دونوں پر حاوی ہوجاتا ہے۔ اور یہ دیکھنے والے کو مسحور کر لیتا ہے۔ بدقسمتی سے اسے معیارات کی تشکیل، تعلیم اور اقدار کی ترویج میں استعمال نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسے نظام تعلیم کی کلیت کا جزو مانا گیا۔ روایتی کلچروں اور جدید صنعتی معاشروں کے نظام تعلیم کا تقابل خاصا دلچسپ ہے۔ روایتی معاشروں میں خاندان کی کئی نسلیں ایک چھت تلے زندگی بسر کرتی چلی آئی ہیں۔ اسی لیے وہاں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کا اپنے دادا دادی اور نانا نانی سے براہ راست رابطہ رہتا ہے اور بچوں میں اقدار و روایات کی ترسیل ہوتی رہتی

ہے۔ بالعموم بڑے بوڑھوں کی عزت کی جاتی ہے اور انہیں عقل، علم اور تمدن کا خزانہ مانا جاتا ہے۔

بالعموم جدید معاشرت میں ترجیحاً خاندان کو صرف بچوں اور والدین تک محدود رکھا جاتا ہے۔ بوڑھے لوگ ایک طرف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگی اپنی کمیونٹیوں یا خاص طور پر بنائے گئے اولڈ ہاؤسوں میں گزارتے ہیں۔ ان کی اقدار اور معیارات فرسودہ قرار پاتے ہیں۔ تمام مغربی معاشروں کے نوجوانوں کی زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ یہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور انہیں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اگرچہ جنریشن گیپ کے سبب بچوں کو ثقافت، اقدار اور کلچر اپنی پچھلی نسلوں سے سیکھنے کا موقع نہیں ملتا لیکن انہیں یہ سب مل ضرور جاتا ہے۔ ان کے باپ دادا کا کردار ذرائع ابلاغ سنبھال لیتے ہیں۔ وہ ٹی وی کی پیش کردہ دنیا کو بھی حقیقی دنیا خیال کرنے لگتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ٹی وی اور فلم کا کلچر تشدد کلچر ہے۔

آج ہمارے تمدن میں موجود تشدد کا سب سے بڑا اظہار ویڈیو گیمز میں ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں نہایت مقبول ہونے والی ایک ایسی ہی گیم "Full Warrior" Spectrum پر ڈنمارک کے ایک اخبار نے ایک جائزہ چھاپا تھا۔ اخبار کے مطابق اس گیم کی بنیاد فوج کے ایک تربیتی پروگرام پر رکھی گئی۔ اس کے کنٹرول اتنے زیادہ ہیں کہ نوعمر بچے بھی کھیل سکتے ہیں۔ بچہ اس میں فوراً ڈوب جاتا ہے اور مشن کے آخر تک اس میں موجود رہتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں یہی مرکزی تصور پیش کیا گیا ہے کہ ہماری تیز رفتار ثقافتی ترقی کے برعکس ہمارا جینیاتی ارتقاء بہت سست رو رہا ہے۔ اس سست روی کے سبب جذباتی سطح پر آج کا انسان اب بھی جدید دنیا سے زیادہ اپنے آبا کی شکاریوں کی دنیا کا باشندہ ہے۔ تہذیب نے ہماری ابتدائی جبلتوں کو دبا دیا تھا۔ ذرائع ابلاغ ہماری انہی جبلتوں کو کسی نہ کسی طرح بروئے کار آنے دیتے ہیں اور پھر اسے تفریح کا نام دیتے ہیں۔ مہذب زندگی گزارنے کے لیے اخلاقیاتی قوانین ضروری ہیں۔ لیکن یہ ہم جدید انسانوں کو جذباتی بوجھ لگتے ہیں۔ تفریح مہیا کرنے والی صنعت دیکھنے والے کو موقع دیتی ہے کہ خود کو ان کے کردار، ہیرو اور ہیروئنوں کے ساتھ متشخص ہو کر اخلاقیاتی قواعد توڑتا پھرے۔

MashalBooks.org

اگر مقبولیت کی بنیاد پر تفریحی ذرائع کو جانچا جائے تو تشدد کی عریانیت سرفہرست نظر آئے گی۔ تفریح کو دیکھنے کو کا ایک اور زاویہ بھی موجود ہے۔ تفریح ہمارے پورے نظام تعلیم کا ایک انتہائی اہم حصہ ہے۔

جانور بھی تعلیم پاتے ہیں اور چھوٹی عمر کے جانوروں کے کھیل ان کے تعلیمی عمل کا حصہ ہیں۔ مثال کے طور پر جب شیر کے بچے کھیلتے ہیں تو اصل میں وہ شکار کے لیے ضروری طریقے سیکھتے ہیں۔ دھاگے کے کسی ٹکڑے کے ساتھ کھیلتے بلی کے بچے کے متعلق بھی یہی درست ہے۔ نوعمری میں پڑھی گئی مہم جوئی کی کتابوں میں بھی ایک تعلیم موجود ہے جو انسانوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کی اہلیت دیتی ہے۔ ہر تمدن زبانی روایات، نظم، گیت اور کہانی کو استعمال کرتے ہوئے انسان کی خام فطرت کو بدلنے اور اسے اپنے آئیڈیل کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمل میں تفریح اور تعلیم ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور انسان کو اس کی کمیونٹی کی مطابقت میں لاتے ہیں۔

جدید صنعتی معاشروں میں یہ اہم ترین تعلیمی وظیفہ تجارتی مفادات کے نتیجے میں دب گیا ہے۔ سماجی اعتبار سے مطلوبہ رویے کو سہارا دینے کے بجائے تفریح کی صنعت عام معیار کے نچلے سے نچلے درجے تک پہنچنے کو تیار ہے۔ مناسب اور موزوں تعلیم کم از کم کوکا کولا سے کم اہم نہیں ہے اور ہم کوکا کولا کو تعلیمی ادارے چلانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

آج ہمارے سامنے ایک نئی عوامی اخلاقیات کی تشکیل کا کام موجود ہے۔ ہمیں خاندان، مذہب اور قوم کے ساتھ وفاداری کے جذبے میں انسانیت بطور کل کے ساتھ وفاداری کو شامل کرنا ہوگا۔ ہمیں انتظام کرنا ہوگا کہ اگر تصادم ہو جاتا ہے تو انسانیت کے ساتھ وفاداری غالب رہے۔ ضروری ہے کہ ہم تشدد کے کلچر کی جگہ امن کے کلچر کو فروغ دیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع ابلاغ کا تعاون ناگزیر ہے۔ یہاں ہمارا واسطہ ایک قبضے سے پڑتا ہے۔ ایک طرف تو فن کارانہ اظہار لازم ہے اور سنسر شپ پسندیدہ چیز نہیں لیکن دوسری طرف اقدار و معیارات کی تشکیل میں ذرائع ابلاغ کا اثر و رسوخ دیکھتے ہوئے ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ آج بھی تفریح کی صنعت نے کچھ حدود کو از خود اپنا رکھا ہے۔ امریکہ میں رجحان موجود ہے کہ فلم اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں جج کا تعلق کسی اقلیتی گروپ سے ہوتا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ بین الاقوامی تنازعات کی منظر نگاری کرتے

MashalBooks.org

ہوئے تشدد اور جنگ کے جذبات کو ہوا نہیں دی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ ہم ٹیلی ویژن والوں کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ ڈیوڈ اٹینبر و اور گاندھی کی سوانح حیات کے علاوہ کچھ نہ دکھائیں۔ تاہم اگر اتنا ہی ہو جائے کہ کسی فلم کو محض مقبولیت اور فنکارانہ خوبیوں کی بنیاد پر داد و تحسین سے نہ نوازا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ عالمی امن اور عدم تشدد پر کس طرح کے منفی یا مثبت نتائج مرتب کر رہی ہے۔ ابھی چند سال پہلے جب سی این این ابھی ٹیڈ ٹرنر کی ملکیت تھا تو اس نیٹ ورک نے عالمی موسمی حالات کا ایک پروگرام متعارف کروایا تھا۔ نیٹ ورک کے موجودہ مالک ٹرنر جتنے آئیڈیلسٹ تو نہیں لیکن سی این این پر یہ پروگرام اب بھی جاری ہے۔ یہاں سے یہ روایت بی بی سی نے اپنائی ہے۔ اب ہمیں ٹیلی ویژن سے فقط یہی نہیں ملتا کہ آج چھتری لے کر نکلا جائے یا اس کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔

اقوام متحدہ نے تاحال اپنا کوئی عالمی ٹیلی ویژن اور ریڈیو نیٹ ورک نہیں بنایا۔ اس طرح کا ادارہ عالمی سیاست اور ماحولیات کے حوالے سے زیادہ غیر جانبدارانہ تبصرہ کر سکتا ہے۔ اس پر تاریخ، افکار اور دیگر علمی پروگرام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نئے سال کے موقع پر لوگ ماضی اور مستقبل کے متعلق نسبتاً زیادہ سوچتے ہیں۔ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اقوام متحدہ گزرنے والے سال کے وقوعات، اختلافات اور ان کے حل پر پروگرام پیش کر سکتا ہے۔

انٹرنیٹ کے امکانات

ستر اور اسی کے عشرے میں دنیا کے مختلف حصوں میں موجود کمپیوٹروں کو باہم منسلک کرنے کا کام شروع ہوا۔ یورپ میں بیٹھا ایک سائنس دان اس قابل ہو گیا کہ امریکہ میں موجود کمپیوٹر سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح اعداد و شمار، خطوط اور مسوّدے کی تیز رفتار ترین ترسیل ممکن ہوئی۔

انٹرنیٹ کی تاریخ کا آغاز 1961ء سے ہوتا ہے جب ایم آئی ٹی کے ایک طالب علم لیونارڈ کلین روک نے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ اسی موضوع پر پیش کیا تھا۔ ہمیں ایسے نیٹ ورک کے امکانات ملتے ہیں جسے ٹیلی فون ایکسچینج سے زیادہ ڈاک خانے کی طرز پر چلایا

MashalBooks.org

جاسکتا ہے۔ ٹیلی فون کے نظام میں دوطرفہ گفتگو کی سہولت دی جاتی ہے لیکن پیکج سوئچنگ نظام میں اس طرح کی کوئی پابندی موجود نہیں۔ یہاں بھیجنے اور موصول کرنے والوں کے فقط ایڈریس ہی کافی ہیں اور یوں پیغام گرہ در گرہ سفر کرتا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ ہمارا آج کا انٹرنیٹ نظام ایک بہت بڑا پیکج سسٹم ہے۔

چونکہ انٹرنیٹ مرکزیت پر مبنی نظام نہیں اور یہ کئی نوڈوں اور بہت سے کمپیوٹروں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہ ذرائع ابلاغ کے کسی بھی دوسرے واسطے کے مقابلے میں زیادہ جمہوری ہے۔ دیگر تمام ذرائع ابلاغ پر حکومتیں اور بڑی کارپوریشنیں کسی نہ کسی طریقے سے مسلط ہو چکیں۔ فقط تھوڑے سے استثنا کے ساتھ کتابیں، فلمیں، اخبار، رسالے، ٹیلی وژن اور سکول سب ہیئت مقتدرہ کو تقویت دیتے ہیں۔ غیر سنسر شدہ اور آزاد آراً کے لیے انٹرنیٹ سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔*

* انٹرنیٹ نسبتاً نئی شے ہے لیکن حکومتیں ابھی سے اسے قابو میں رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ اس سلسلے میں چینیوں کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

MashalBooks.org

10

عالمی حکومت

اقوام متحدہ کی اصلاح

اب تک ہم نے دیکھا ہے کہ تھرمو نیوکلیائی ہتھیاروں اور ابلاغ اور اقتصادی انحصار باہمی کے اس دور میں مطلق آزاد قومی ریاست ایک خطرناک تصور بنتی جارہی ہے۔ مستقبل کے لیے ہماری سب سے بڑی امید یہی ہے کہ اقوام متحدہ عالمی فیڈریشن کی صورت اختیار کر جائے۔ اقوام متحدہ کو تقویت دینے کے بعد اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ قوانین بنا کر افراد کو ان کا پابند کر سکے۔ کوئی بھی سیاسی رہنما ان قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اسے گرفتار کر سکے۔ اس طرح کی عالمی فیڈریشن کے پاس ضروری قانونی اور فوجی قوت بھی ہونی چاہیے تاکہ وہ مختلف اقوام کے اندر بسنے والی نسلی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کر سکے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اقوام متحدہ کا موجود چارٹر حرف آخر نہیں ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ اسے باہم منحصر عالمی معاشرت کے تناظر میں بدلا جائے۔ یاد رہے کہ اس کے چارٹر پر دستخط ہیروشیما پر بم گرانے کے بعد ہوئے اور نہ ہی تب سوچا جا سکتا تھا کہ بین الاقوامی تجارت اور ابلاغ یوں حیرت انگیز طور پر ترقی کریں گے۔

اقوام متحدہ کے منشور کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے پاس اقتدار کے

MashalBooks.org

حوالے سے قانون سازی کی گنجائش موجود نہیں۔ اس وقت بین الاقوامی قانون اقوام کو فرد کی حیثیت دیتا ہے۔ کوئی قانون ٹوٹتا ہے تو ہم پوری قوم پر پابندیاں لگا دیتے ہیں۔ خواہ کسی ملک کا رہنما واحد مجرم ہو، اس کے بے گناہ شہری خوامخواہ پابندیوں کا عذاب بھگتتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اقوام متحدہ کے پاس بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے افراد کے خلاف قانون سازی اور انہیں سزا دینے کے اختیارات موجود ہوں۔ اقوام متحدہ کے موجودہ نظام کی ایک اور خامی یہ ہے کہ اس میں ایک قوم ایک ووٹ کا اصول اپنایا گیا ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ اس کا مقصد اقوام کے مابین مساوات ہے۔ حالانکہ اپنی اصل میں یہ عمل نہایت غیر منصفانہ ہے۔ مثال کے طور پر اس میں چین یا ہندوستان کے ایک شہری کو ملنے والا ووٹ کا حق مالٹا یا آئس لینڈ کے شہری کے حق کا کئی ہزارواں حصہ بنتا ہے۔ واضح پتہ چلتا ہے کہ ووٹ کا نظام بدلنے کی ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کے موجودہ نظام میں بھی انسانی حقوق کی ضمانتیں فراہم کی گئی ہیں لیکن ان ضمانتوں پر عمل درآمد کا کوئی موثر نظام موجود نہیں۔ خود اس منشور کے اندر تضادات موجود ہیں کہ ایک طرف یہ انسانی حقوق کے تحفظ کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف قومی ریاستوں کو مطلق آزادی دیتا ہے۔ ہمارے اس موجودہ دور میں بھی کئی قومی ریاستوں نے اپنے اقلیتی گروپوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ بحیثیت خودمختار اور آزاد ریاست انہیں اپنے اندرونی معاملات نمٹانے کا حق حاصل ہے۔ زہریلی گیس کے استعمال جیسی انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی روکنا بین الاقوامی کمیونٹی کی ذمہ داری ہے۔ اگر اس کی راہ میں مطلق ریاستی خودمختاری حائل ہوتی ہے تو اسے بھی ختم ہوجانا چاہیے۔ بین الاقوامی قانون کی بڑھتی ضرورت نے ثابت کر دیا ہے کہ مطلق خودمختار قومی ریاست فرسودہ از کار تصور ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹوں میں سے ایک یعنی برطانوی پارلیمنٹ نے ابھی پچھلے دنوں اس ضرورت کو محسوس کیا ہے کہ برطانوی قانون پر یورپی یونین کے قانون کو فوقیت ملنی چاہیے۔

آج ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت ابلاغ نہایت تیز ہوگیا ہے۔ ٹوکیو میں آنے والا مالی ارتعاش نیو یارک کو ہلا دیتا ہے۔ ابلاغ اور نقل وحمل کی سہولتوں نے فاصلے مٹا دیئے ہیں۔ انہیں ممالک کے مابین اچھے تعلقات کے لیے استعمال کرنا مشکل نہیں رہا۔ کم ہوتے

فاصلے اور بڑھتے باہمی انحصار نے موثر بین الاقوامی قانون کی ضرورت اجاگر کر دی ہے۔ تاہم بین الاقوامی قانون کو مقامی قوانین کے ساتھ متوازن رکھنا بھی ضروری ہے۔ حیاتیاتی تنوع کی طرح ثقافتی تنوع بھی انسانیت کا بہت بڑا خزانہ ہے۔

بین الاقوامی پولیس فورس؟

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک اقوام متحدہ نے کئی بار دنیا کے مختلف حصوں میں افواج بھیجنے کی سفارش کی ہے۔ بعض مواقع پر اقوام متحدہ نے یہ ضرورت انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر محسوس کی۔ اس کی ایک مثال بوسنیا اور روانڈا میں ہونے والے قتل عام پر اقوام متحدہ کا ردعمل تھا۔ اگر روانڈا میں فوج بھجوانے کا فیصلہ فوری کر لیا جاتا تو بہت ساری جانیں بچائی جاسکتی تھیں۔ قرارداد پیش کرنے سے لے کر افواج کے پہنچنے تک بے شمار سیاسی اور طبیعی رکاوٹوں پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے میری تجویز ہے کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کے پاس اپنی مسلح افواج مستقلاً ہونی چاہئیں۔ ضروری ہے کہ اس فوج میں تمام ملکوں کی مناسب نمائندگی موجود ہو۔ اس فوج کا رکن ہونے کے حوالے سے افراد خود اپنی قومی حکومتوں کے ساتھ وفادار رہنے کی ضرورت سے آزاد ہو جائیں گے۔ اس بین الاقوامی پولیس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ بڑے پیمانے پر ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزی روکے اور بین الاقوامی قانون کی حفاظت کرے۔

ہماری آج کی دنیا میں اچھی اور بُری دونوں طرح کی حکومتوں کی مثال موجود ہے۔ اچھی حکومت بنانا اور اسے قائم رکھنا مشکل مسئلہ سہی لیکن ناممکن نہیں۔ کینیڈا، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ اور سکینڈے نیویائی ممالک کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اچھی حکومت کا اصول ممکن ہے۔ کسی بھی اچھی حکومت میں پولیس کو بہت زیادہ اسلحہ سے مسلح رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قوانین کی پابندی اور نظم ونسق بزورقوت نافذ نہیں ہوتے۔ شہریوں کی اکثریت کا کسی شے پر متفق ہو جانا اس پر عملدرآمد کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ انسان بنیادی طور پر اچھائی اور برائی دونوں سے متصف ہے۔ انسان کو مکمل ڈھیل نہیں دی جاسکتی۔ بصورت دیگر معاشرتی ڈھانچہ بہت جلد برباد ہو جائے گا۔ بہرکیف ایک جمہوری اور منصفانہ حکومت میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کا بوجھ بہت زیادہ نہیں ہوتا اور نہ ہی انہیں بھاری اسلحہ فراہم کرنا پڑتا ہے۔ ان

MashalBooks.org

ملکوں کی پولیس کے پس پشت رائے عامہ کی قوت موجود ہوتی ہے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ قوانین افراد کی طرح کام کرتے ہیں اور کسی فرد واحد سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی پورے سیکشن کے خلاف بھاری مزاحمت پیش کرے گا۔ عالمی فیڈریشن تحریک کے بانیوں میں سے ایک وائنر (Wynner) اچھی حکومت کی حامل معاشرت میں پولیس کے خدّ وخال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے*:

1۔ ''پولیس والا ایک منظم حکومت کے نظام کے اندر رہ کر عمل کرتا ہے۔ اس حکومت کو افراد پر انتظامی، آئینی اور عدالتی قوت حاصل ہے۔ پولیس والے کے عمل واضح انداز میں موجود ضابطہ فوجداری کے اندر رہتے ہیں اور ضابطہ فوجداری خود کمیونٹی نے منظور کیا ہے جس میں وہ بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پولیس والا دیئے گئے اختیار کا غلط استعمال نہیں کر پائے گا۔''

2۔ ''کوئی پولیس والا دو لڑتے افراد میں سے کسی ایک کو بے قصور یا مجرم نہیں ٹھہرائے گا اور نہ ہی وہ حق پر نظر آنے والے شخص کو اجازت دے گا کہ دوسرے کو پیٹتا رہے۔ اس کا فریضہ یہی ہے کہ دونوں طرف سے ہونے والے تشدد کو روکے اور معاملہ جج کے سامنے پیش کر دے۔ اور پھر عدالت کے حکم پر عملدرآمد کو یقینی بنائے۔''

3۔ ''اپنے فرائض کی انجام دہی میں پولیس مشتبہ کو روکتے ہوئے کمیونٹی کو حاصل حقوق کا تحفظ کرے۔ اسے خیال رکھنا ہوگا کہ مشکوک کو ملنے والے حقوق کی خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے۔ اور کمیونٹی نہ صرف جانی اور مالی نقصان سے محفوظ رہے بلکہ مجموعی انسانی حقوق کو بھی عدالتی تحفظ ملے۔''

فیڈریشن: ماضی، حال اور مستقبل

تاریخ کی رو سے ریاستوں کی فیڈریشن ایک ایسی محدود یونین ہے جہاں وفاقی حکومت کے پاس افراد پر نافذ العمل قوانین بنانے کا اختیار موجود ہے۔ لیکن تمام اختیارات

* ایڈتھ وائنر (Edith Wyner) کی کتاب
"World FederalGovernment in Maximum Terms: Proposal for United Nations Charter Revision". Fedonat Press, Afton New York, (1954).

MashalBooks.org

ازخود وفاق کو حاصل نہیں ہوتے بلکہ ریاستوں کے پاس رہتے ہیں۔دوسرے الفاظ میں فیڈریشنوں میں شامل ہر ریاست اپنے داخلی معاملات، اپنے قوانین اور طریقوں کے مطابق چلاتی ہے لیکن بعض طے شدہ معاملات میں قانون سازی کا اختیار وفاق کو دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر دنیا کی اقوام فیصلہ کر لیتی ہیں کہ منشیات کا معاملہ ان سب کا باہمی معاملہ ہے اور وہ یہ بھی فیصلہ کرتی ہیں کہ ان کی افزائش اور تقسیم پر قانون سازی کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا جائے جس کے پاس قانون سازی اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف اقدامات کے اختیارات موجود ہوں گے تو کہا جائے گا کہ بین الاقوامی سطح پر منشیات پر قابو پانے کے لیے ایک فیڈریشن تشکیل دی گئی ہے۔

اسی طرح اگر اقوام کی ایک برادری کسی کمیشن کو کثیر قومی کارپوریشنوں کے حقوق و فرائض کے حوالے سے قوانین بنانے کا اختیار دیتی ہے اور اسے ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو گرفتار کرنے یا جرمانہ کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے تو پھر ہمارے پاس وسیع تر اختیار کی حامل ایک عالمی فیڈریشن وجود میں آئے گی۔لیکن یہاں بھی یہ اختیارات نہایت محدود ہوں گے اور ان کی تعریف بڑی احتیاط سے کی جائے گی۔فیڈریشن کی تشکیل کے وقت رکن ریاستیں فیصلہ کر سکتی ہیں کہ اسے کون سے اختیارات دیئے جائیں۔باقی ماندہ اختیارات ریاستوں کے پاس رہیں گے۔

چونکہ فیڈریشن کی ساخت اس طرح کی ہے کہ اسے محدود اور متعین اختیارات حاصل ہیں۔چنانچہ مقامی خود مختاری قائم رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی ایک عالمی حکومت بنائی جا سکتی ہے۔مناسب ہوگا کہ کچھ فیڈریشنوں کی تاریخ کو بغور دیکھا جائے۔یوں ہمیں غور وفکر کے نئے خطوط میسر آئیں گے۔

قدیم یونان میں کئی فیڈریشن موجود تھیں۔ان میں سے ایک "Amphictyonic League" تھی۔اصلاً یہ بارہ قبائل کی ایک لیگ تھی اور اسے مذہبی معاملات کے نظم وضبط اور مقدس مقامات کی دیکھ بھال کا کام دیا گیا تھا۔اس لیگ کے اجلاس سال میں دو بار منعقد ہوتے تھے۔بہار یہ اجلاس دیمتری کے مندر میں اور موسم خزاں کا ڈیلفی کے مندر میں منعقد ہوا کرتا تھا۔اس لیگ کو خصوصی مقصد کی لیگ سمجھا جا سکتا ہے۔اس لیگ کو بعض مذہبی معاملات میں اختیار حاصل تھا لیکن دیگر تمام فیصلے رکن قبائل خود کرتے تھے۔

MashalBooks.org

خصوصی مقصد کے لیے تشکیل دی جانے والی فیڈریشنوں میں سے ایک "Hanseatic League" تھی۔ شمالی یورپ میں بننے والی یہ لیگ بارہویں تا سترہویں صدی میں سرگرم رہی۔ یہ لیگ ان تاجروں کی ایک ایسوسی ایشن تھی جو بالٹک سے پکڑی جانے والی ہیرنگ مچھلی کو محفوظ کرنے اور بیچنے سے وابستہ تھے۔ تب ایسے بہت سے دن ہوتے تھے جب گوشت کی ممانعت تھی لیکن مچھلی کھائی جاسکتی تھی۔ اسی لیے ازمنہ وسطیٰ میں ماہی گیری خاصا منافع بخش کاروبار تھا۔ دور عروج میں اس لیگ میں کوئی ساٹھ شہروں کے تاجر شامل تھے۔ آگے چل کر ہر شہر کی اپنی تاجر ایسوسی ایشن تھی جو شہر کے اندر معاملات کی ذمہ دار تھی۔ شہری ایسوسی ایشنیں شہروں کے درمیان تجارتی معاملات طے کرنے کے لیے ایک ذیلی فیڈریشن "Hanseatic Diet" بناتی تھیں۔ مچھلی کے علاوہ یہ ایسوسی ایشنیں اناج، عمارتی لکڑی، شہد، امبر اور گودام کا کام بھی سرانجام دیتی تھیں۔ لیگ کے تاجروں کا مقصد تھا کہ ان اشیائے صرف پر اجارہ داری قائم کی جائے۔

خصوصی مقاصد کے تحت قائم ہونے والی فیڈریشن کی ایک عمدہ مثال یونیورسل پوسٹل یونین ہے۔ یونین کے قیام سے پہلے ڈاک کے معاملات میں باہمی تعاون کے خواہاں ملک دوطرفہ مذاکرات کیا کرتے تھے۔ مذاکرات کے نتیجے میں مختلف ممالک کے مابین مختلف شرائط طے پاتیں اور یوں بین الاقوامی سطح پر کئی پیچیدگیاں جنم لیتیں۔ چنانچہ 1863ء میں ریاستہائے متحدہ کی درخواست پر ایک انٹرنیشنل پوسٹل کانگرس منعقد کی گئی جس کے نتیجے میں 1874ء میں معاہدۂ برن (Berne Treaty) پر دستخط ہوئے۔ اور یوں جنرل پوسٹ یونین (GPU) قائم ہوگئی۔ 1878ء میں اسے یونیورسل پوسٹ یونین کا نام دیا گیا۔ اس یونین نے کئی انقلابی اقدامات متعارف کروائے۔ مثال کے طور پر دنیا میں کسی بھی جگہ خط پہنچانے کے لیے کم وبیش ایک سے ٹکٹ لگائے گئے۔ غیر ملکی اور ملکی ڈاک کے ساتھ یکساں ترجیحات رکھنا قرار پایا۔ یو پی یو (UPU) بننے کے بعد ضروری نہ رہا کہ اس خط پر ان تمام ملکوں کے ٹکٹ لگے ہوں جن میں سے اسے گزرنا ہے۔ حالانکہ پہلے یہی ہوا کرتا تھا۔ یہ ادارہ نا قابلِ یقین حد تک سخت جان ثابت ہوا۔ رکن ریاستوں کی باہمی عداوتوں اور ان کے اندرونی سیاسی انتشار کے باوجود یہ ادارہ کم وبیش مسلسل کام کرتا رہا۔

خصوصی مقاصد کے تحت قائم ہونے والی فیڈریشنوں کی اِن مثالوں سے پتہ چلتا

ہے کہ کسی فیڈریشن کے دائرۂ کار اور اختیار کو بہت محدود رکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات فیڈریشن ایک بار وجود میں آ چکنے کے بعد بتدریج اپنے اختیارات خود بخود بڑھا لیتی ہے۔ مثال کے طور پر شمالی یورپ کے تاجروں کی مذکورہ بالا تنظیم اتنی مضبوط ہوئی کہ اس نے اپنی فوج تک رکھ لی۔ 1369ء میں اس ادارے نے اپنے حریف تاجروں کو نقصان پہنچانے کے لیے کوپن ہیگن کا قلعہ تباہ کر دیا۔*

آج دنیا میں موجود کل ممالک میں سے آدھے کسی نہ کسی طرح فیڈریشن کی تعریف میں آتے ہیں۔ سوئس فیڈریشن نہایت دلچسپ مثال ہے کیونکہ یہاں چار مختلف زبانیں جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور رومانسش بولنے والے بستے ہیں۔ 1291ء میں یہاں کے تین بڑے شہروں کے باسیوں نے اپنے ایک اجلاس میں پہلی سوئس فیڈریشن تشکیل دی اور قرار پایا کہ آئندہ ہم برادرانہ بنیادوں پر قائم قوم کی حیثیت سے متحد رہیں گے۔ چودھویں صدی میں پانچ اور شہر اس فیڈریشن میں شامل ہو گئے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں پانچ مزید شہر فیڈریشن میں آئے۔ 1648ء میں اس فیڈریشن نے خود مختار ہونے کا اعلان کیا۔ 1812ء میں سوئس فیڈریشن نے اعلان کیا کہ وہ دیگر ممالک کے درمیان جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہے گی۔ 1815ء میں فرانسیسی خواں خطے سوئٹزرلینڈ میں آئے اور اس کی موجودہ حدود کا تعین ہوا۔ بعض حوالوں سے سوئٹزرلینڈ نہایت ترقی یافتہ جمہوریت ہے اور اہم معاملات کا فیصلہ براہِ راست ریفرنڈم کے ذریعے ہوتا ہے۔ دوسری طرف سوئٹزرلینڈ میں خواتین کو ووٹ کا حق 1971ء میں ملا۔ اور کہیں 1990ء میں اس پر عمل درآمد ہو سکا۔ اسے 2002ء میں اقوامِ متحدہ کا رکن بنایا گیا۔

ریاستہائے متحدہ کا وفاقی آئین بھی آئین کی تاریخ میں اہم اور مؤثر مانا جاتا ہے۔ اس نے خاص طور پر جنوبی امریکہ کی کئی ریاستوں کے لیے مثال کا کام دیا۔ یہ مثال اس لیے زیادہ دلچسپ ہے کہ 1877ء میں کنفیڈریشن آرٹیکلز کی رُو سے وجود میں آنے والی اصل یونین خاصی کمزور ثابت ہوئی تھی اور گیارہ برس کے بعد ہی اس کی جگہ فیڈرل آئین متعارف کروانا پڑا تھا۔ امریکی خانہ جنگی کے حوالے سے مزید سیکھا جا سکتا ہے۔

انگلینڈ کے خلاف جنگ انقلاب کے دوران تیرہ سابقہ نوآبادیوں نے اپنے

* اس قلعہ کو تباہ کرنے کے فیصلے کو باقاعدہ نعروں کی شکل دی گئی۔

MashalBooks.org

نمائندے براعظمی کانگرس میں بھیجے اور 10 مئی 1776ء کو کانگرس نے ہر نوآبادی کو اختیار دیا کہ وہ اپنے طور پر صوبائی حکومت بنانے میں خودمختار ہے۔ 4 جولائی 1776ء کو اس کانگرس نے آزادی کا اعلامیہ باقاعدہ جاری کر دیا۔ اگلے سال کانگرس نے کنفیڈریشن آرٹیکلز پاس کئے اور ایک نئی ریاستہائے متحدہ کی حکومت کا تعین ہوا۔ جنگ انقلاب 1783ء میں ختم ہوئی اور فریقین نے معاہدہ پیرس پر دستخط کر دیئے۔ اس کی رو سے ریاستہائے متحدہ کو آزادی ملی۔ تاہم جلد ہی پتہ چل گیا کہ کنفیڈریشن آرٹیکلز کچھ زیادہ ہی کمزور ہیں۔ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یونین کے قوانین کا اطلاق صرف رکن ریاستوں پر ہوتا تھا اور اس کے شہریوں پر نہیں۔

بالآخر 1787ء میں فلاڈیلفیا میں ایک نیا آئینی کنونشن منعقد ہوا تا کہ نیا اور زیادہ موثر آئین بنایا جا سکے۔ اسی سال الیگزینڈر ہملٹن نے نیم خودمختار ریاستوں کی یونین کی مدد سے قابل عمل حکومت کا تجزیہ پیش کیا جسے فیڈرلسٹ پیپرز کہا جاتا ہے۔ ان کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ریاستی اختیار کی کمی عملاً ممکن نہیں اور یہ کہ ریاستوں کی یونین سے بننے والی حکومت کا اختیار فرد پر بھی ہو۔ 1788ء میں بننے والے ریاستہائے متحدہ کے فیڈرل آئین میں اس خیال کو مرکزی حیثیت دی گئی۔ اس نئے آئین کی ایک اور خاصیت یہ تھی کہ قانون سازی کا اختیار سینیٹ اور ایوان نمائندگان کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ سینیٹ میں تمام ریاستوں کو مساوی نمائندگی حاصل تھی جبکہ ایوان نمائندگان میں نمائندگی آبادی کے تناسب سے دی گئی تھی۔ آئین میں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کو الگ الگ رکھا گیا تھا۔ 1789ء میں ''بل آف رائٹس'' بھی آئین میں شامل کر دیا گیا۔

جارج میسن کا خیال تھا، ''افراد پر براہ راست عمل داری کی حامل حکومت ضروری تھی جو غلطی کے مرتکب افراد کو سزا دے سکتی ہے۔'' فیڈرل آئین کے معماروں میں سے ایک اور، جیمز میڈیسن، نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا، ''اگر قانون کا اطلاق انفرادی کی بجائے اجتماعی سطح پر کیا جائے تو نہ صرف یہ قابل عمل اور کارگر نہیں رہتا بلکہ اس کے منصفانہ ہونے میں بھی شبہ ہے۔ کنفیڈریشن آرٹیکلز کا تجزیہ کرتے ہوئے الیگزینڈر ہملٹن نے لکھا، ''ریاست کی گوشمالی سے زیادہ پاگل پن اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی معقول شخص ایسی حکومت کی حمایت نہ کرے گا جس کے پاس جنگ واحد سہارا ہو۔ اس طرح کی ہر جنگ میں بے گناہ مجرم قرار پاتا ہے۔ اسی ایک امر کی بنیاد پر ہر معصوم شہری ایسی حکومت کے خلاف ہو جائے گا۔ اِس

بُرائی کا ایک ہی علاج ہے کہ وفاقی حکومت کا اختیار افراد پر اسی طرح کا ہو جیسا ریاستوں کا ہے۔''

اقوام متحدہ کا منشور کنفیڈریشن آرٹیکلز کے ساتھ متماثل ہے۔ اس منشور کے تحت ریاستوں کی گوشمالی کی جاتی ہے۔ اور یہی عمل ہے جسے الیگزینڈر ہملٹن نے پاگل پن قرار دیا ہے۔ خواہ یہ گوشمالی اقتصادی پابندیوں کی صورت ہو یا فوجی مداخلت کی شکل میں۔ اس کی عملی افادیت اور مبنی بر انصاف ہونا قرین قیاس نہیں۔ اس لیے کہ یہ کسی بھی قوم پر اجتماعی سطح پر لاگو ہونے والی سزا ہے اور افراد بچ نکلتے ہیں۔ ہملٹن کہتا ہے کہ افراد پر لاگو ہونے والے ایسے قوانین ضروری ہیں جس طرح کے ریاستوں کے پاس ہوتے ہیں۔

چونکہ ابتدا میں ریاستوں کو ایک دوسرے پر اعتبار نہیں تھا۔ چنانچہ امریکی وفاقی حکومت کو کم از کم اختیار دیئے گئے۔ تاہم یہ حکومت رفتہ رفتہ مضبوط ہونے لگی اور افراد بھی اس کے دائرۂ کار میں آتے چلے گئے۔ یہاں "Hanseatic League" کا ایک بار پھر یاد دلانا ضروری ہے جس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی سرگرمیوں کا احاطہ وسیع کر لیا تھا۔

امریکی خانہ جنگی سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ کامیاب فیڈریشن کے لیے ریاستی اور وفاقی اختیارات کی تقسیم کا کام انتہائی احتیاط سے کرنا ہوگا۔ اس تقسیم کو ''اصولِ تکمیل'' "Priniple of Subsidiarity" کے تحت قائم ہونا چاہیے۔ یعنی کوشش کی جائے کہ اگر مسئلے میں غیر مقامی عنصر موجود نہیں تو اس کا فیصلہ نچلی سے نچلی سطح پر کیا جائے۔ امریکی خانہ جنگی بنیادی طور پر شمال اور جنوب کے درمیان اِس تنازعہ کا نتیجہ تھی کہ وفاقی اور ریاستی حکومتوں کے مابین اختیار کی تقسیم کس طرح کی جائے۔ خانہ جنگی کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس نے امریکی آئین کے اصولوں میں سے ایک کی کمزوری واضح کر دی۔ دیکھنے میں آیا کہ ریاستوں کی گوشمالی غیر منصفانہ اور کارگر عمل نہیں اور اسی لیے وفاقی حکومت کی عمل داری کو انفرادی سطح پر شہریوں تک پھیلایا جائے۔ یہ درست ہے کہ شمال نے جنوب پر کامیابی حاصل کی لیکن لاکھوں اموات پر منتج ہونے والے عمل کو کامیابی کہنا درست نہیں۔

آسٹریلیا کی وفاقی حکومت بھی خاصی دلچسپ مثال ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عام شہری بڑے پیمانے کے واقعات پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں اِس برِّاعظم پر موجود چھ برطانوی کالونیوں نے ایک دوسرے پر محصولات

MashalBooks.org

عائد کر دیئے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ''مثلاً دریائے مرے کے پاس رہائش پذیر ایک شہری کو دریا پار کرتے ہوئے ہر بار رک کر محصول دینا پڑے گا۔ یہی حال ریاستوں کے مابین چلنے والی ریلوے اور دریائی پانی کے تنازعوں کا تھا۔ چنانچہ شہریوں کی تنظیموں نے فیڈریشن کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں پورے برّ اعظم میں موجود شہروں کے اندر فیڈریشن لیگیں بن چکی تھی۔ 1893ء میں ان تنظیموں کا اجلاس نیو ساؤتھ ویلز میں ہوا اور ایک آئینی کنونشن کا ہونا قرار پایا۔ طے پایا کہ بننے والا آئین تمام کالونیوں میں ریفرنڈم کے ذریعے منظور ہوگا۔ تاریخ میں پہلی بار عام شہری قوم سازی کے عمل میں حصہ لے رہے تھے۔ مئی 1901ء میں آسٹریلیا کے پہلے وفاقی اِنتخابات منعقد ہوئے اور اسی سال آسٹریلیا کی پہلی وفاقی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔

اقوامِ متحدہ کی اصلاحات کے حوالے سے یورپی یونین کی تاریخ بھی انتہائی اہم نکات فراہم کرتی ہے۔ جنگِ عظیم اوّل اور دوم کے دوران ہونے والے جانی اور مالی نقصان نے بیشتر سیاست دانوں کو قائل کر لیا تھا کہ یورپی ممالک کا اقتصادی اور سیاسی اکٹھ ضروری ہے۔ 1950ء میں فرانس کے وزیرِ خارجہ رابرٹ شومان (Robert Schuman) نے تجویز پیش کی کہ یورپی ممالک میں موجود کوئلے اور فولاد کی صنعتوں کو اکٹھا کر دیا جائے۔ یوں بلجیئم، نیدر لینڈز، مغربی جرمنی، لکسمبرگ، فرانس اور اٹلی کی صنعتوں نے متحد ہو کر یورپین کول اینڈ سٹیل کمیونٹی (ECSC) تشکیل دی۔ اِن ممالک میں کوئلے اور فولاد کی پیداوار کے حوالے سے فیصلے کرنے کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جو تمام ملکوں کے اندرونی فیصلوں پر غالب فیصلے کر سکتی تھی۔ اِس ادارے (ECSC) کو خاص مقصد کے تحت بننے والی فیڈریشن کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا ادارے کی کامیابی دیکھتے ہوئے انہی چھ ممالک نے 1957ء میں معاہدۂ روم کے تحت اپنے اقتصاد کے کچھ مزید پہلو باہم مدغم کئے۔ رکن ریاستوں نے محصولات کی رکاوٹ ختم کرتے ہوئے ایک مشترکہ منڈی بنائی جسے یورپین اکنامک کمیٹی کا نام دیا گیا۔ اسی معاہدے کے تحت ایٹمی توانائی کی یورپی کمیونٹی یوریٹم (EURATOM) قائم ہوئی۔ 1967ء میں EEC، ECSC اور EURATOM کو ملا کر ایک واحد کمیشن تشکیل دیا گیا۔ یہی یورپی پارلیمنٹ تھی۔ پہلے پہل ہر ملک کی پارلیمنٹ رکن منتخب کرتی تھی۔

MashalBooks.org

1979ء کے بعد سے براہِ راست انتخابات ہونے لگے اور ہر پانچ سال کے بعد لوگ فیصلہ کرنے لگے کہ وہ یورپی یونین میں نمائندگی کے لیے کسے منتخب کرتے ہیں۔

1973ء میں ڈنمارک، آئر لینڈ اور برطانیہ، 1981ء میں یونان اور 1986ء میں سپین اور پرتگال بھی EEC میں آ گئے۔ 1992ء میں معاہدۂ ماسٹریشٹ کے تحت دفاع، انصاف اور امورِ داخلہ کے حوالے سے مزید تعاون کے فیصلے ہوئے اور EEC کو یورپی یونین (EU) قرار دیا گیا۔ اقتصادی کمیونٹی سے شروع ہونے والی تنظیم بالآخر سیاسی یونین بن گئی۔ "Heanseatic League" کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اِس کا آغاز بھی ایک اِقتصادی لیگ کے طور پر ہوا اور رفتہ رفتہ یہ ایک اِقتصادی تنظیم بن گئی۔

1992ء کے بعد یورپی یونین ایک مرکزی بینک اور مشترکہ کرنسی کے حصول میں کوشاں تھی۔ 2002ء میں 15 رکن ممالک میں سے 12 میں یورپی کرنسی یورو متعارف کروائی گئی۔

4 دسمبر 1950ء کو روم میں انسانی حقوق کے یورپی کنونشن پر دستخط ہوئے۔ یوں انسانی حقوق کے یورپی ڈائریکٹوریٹ جنرل کی کونسل وجود میں آئی جو بنیادی اِنسانی حقوق، اِقتصادی و سماجی حقوق، تشدّد کی روک تھام، قومی اقلیتوں، نسل کشی، ذرائع ابلاغ کی آزادی اور مرد و زن کی مساوات جیسے مسائل پر کام کرتی ہے۔ یورپی یونین کے شہری جانتے ہیں کہ اگر ان کے انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں تو وہ سٹرپسبرگ میں واقع اِنسانی حقوق کی یورپی عدالت سے رجوع کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کام کرتے بھی ہیں۔

یورپی سوشل چارٹر ہاؤسنگ، صحت، تعلیم، روزگار، سماجی تحفظ، انفرادی نقل و حمل اور مساوی سلوک جیسے معیارات قائم کرتا ہے۔ سماجی حقوق کی یورپی کونسل چارٹر کے قوانین کا اطلاق کرتی ہے۔ اس کے اراکین دس سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔

2004ء میں چھ نئے اراکین قبرص، چیک ریپبلک، اسٹونیا، ہنگری، لٹویا، لتھوانیا، مالٹا، پولینڈ، سلووا کیہ اور سلووانیہ کو یونین میں شامل کیا گیا۔ اگلے چند سال میں بلغاریہ اور رومانیہ کو بھی یونین میں شامل کر لیا جائے گا۔ ترکی بھی یونین میں شمولیت کا امیدوار ہے۔ نہ صرف یونین کی رکنیت بڑھی ہے بلکہ اس نے اپنا دائرہ کار بڑھاتے ہوئے کلچر، ماحول، زراعت، اشیائے صرف، مسابقت، توانائی، نقل و حمل اور تجارت کے مختلف معاملات

بھی اپنے احاطۂ کار میں لے لیے ہیں۔ کمیونٹی میں شامل اراکین نے باہمی سرحدیں کھول دی ہیں اور شہریوں کو ان میں آنے جانے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اقوام متحدہ کی اصلاحات اور اسے مؤثر بنانے کے حوالے سے یورپی یونین کی کامیابیوں اور اس کے مسائل دونوں سے سبق لیا جا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یورپی یونین ایک بہت بڑی کامیابی ہے اور اس امر کا اظہار ہے کہ خاص مقصد کے لیے بننے والی ایک محدود یونین بتدریج پھیل کر وسیع تر معاملات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اس یونین کا نتیجہ ہے کہ اس کے رکن ممالک کے درمیان جنگ تقریباً ناممکن ہو چکی ہے۔ 1950ء میں ایک مخصوص شعبے میں یونین قائم کرنے والوں کے پیشِ نظر اصل مقصد یہی تھا۔

یورپی یونین کے کچھ اپنے مسائل بھی ہیں اور اِس پر بھی تنقید ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کی اصلاح پر غور وفکر میں اس تنقید اور یونین کے مسائل کا مطالعہ نہایت مفید رہے گا۔

یونین میں شامل کچھ ممالک نے ماحولیات اور کارکنوں کے حقوق کے حوالے سے اعلیٰ معیارات وضع کر لیے ہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ اگر ہر چیز یونین کے کم از کم مساوی قوانین کے تحت کر دی گئی تو ان کی اپنی کامیابیاں بے معنی ہو جائیں گی۔ یہ شکایت بے جا نہیں اور اس حوالے سے دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ تنوّع قابلِ قدر شے ہے اور اِسی لیے قانون سازی کو متجانس کرنا دانش مندی نہیں خواہ اِس کی مدد سے تجارت آسان ہی ہوتی ہو۔ دوسرے یہ کہ اگر یکساں قانون سازی ضروری ہے تو محنت کشوں اور ماحولیات کے حوالے سے اَرفع ترین قوانین کو معیار بنانا چاہیے۔ اقوام متحدہ کی اصلاحات کے حوالے سے بھی انہی خطوط پر کام ہو سکتا ہے۔

یورپی یونین کے حوالے سے آنے والی ایک اور شکایت یہ ہے کہ اس میں فیصلہ سازی کا عمل ایک ایسی جگہ پر ہوتا ہے جو رائے دہندگان کی براہ راست سیاسی رسائی سے باہر ہے۔ یہ تنقید بھی جائز ہے۔ کئی بار ہوا ہے کہ فیصلہ سازی میں یورپی یونین نے فیڈرل اِزم کے قوانین کو غلط معانی پہنائے ہیں۔ فیڈریشن بنیادی طور پر ایک مفاہمت ہے جس میں مقامی سطح کی حکومت خود اختیاری کے حق کو بعض نہایت اہم اور محتاط طور پر منتخب فیصلوں کو مرکزی سطح پر کرنے کی ضرورت کے ساتھ متوازن رکھا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے کہ مرکزی سطح پر ہونے والے فیصلے کم از کم ہوں لیکن ایسے فیصلے بہر حال مقامی سطح پر نہ کئے جائیں جن

کا تعلق پوری قوم سے ہو۔ یہی ''اصولِ تکمیل'' ہے اور اس کے بغیر فیڈریشن نہیں چل سکتی۔

ہمیں ایک ایسی عالمی حکومت بنانے کے چیلنج کا سامنا ہے جو ایک بڑے پیمانے پر علاقائی یا عالمی حکومت کے فوائد مہیا کرتے ہوئے بھی مقامی خود مختار حکومت کے فوائد کو برقرار رکھے۔ چنانچہ ہمیں اِس سوال کو بڑی وقعت دینا ہوگی کہ کِن مسائل کو مقامی، کِن کو علاقائی اور کِن کو عالمی سطح پر طے کیا جائے گا۔

مستقبل میں اِس امر کا امکان موجود ہے کہ دنیا کے کئی خطے آبادی کی زیادتی اور خوراک کی کمی کا شکار ہو جائیں گے۔ چونکہ برتھ کنٹرول اور خاندان کی جسامت جیسے معاملات کے متعلق الگ الگ کمیونٹیاں مختلف رویہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس معاملے کو مقامی سطح پر سلجھانا ضروری ہے۔ لیکن خاندانی منصوبہ بندی اور قحط رفع کرنے کے حوالے سے چلنے والے پروگرام کو عالمی سطح کی ایجنسیوں سے مدد ملے گی۔ بڑے پیمانے کی ہجرت اُس ملک کے لیے ناانصافی ہے جس نے خود اپنی آبادی کو مستحکم رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ مہاجرین اور تارکینِ وطن کے متعلق فیصلے کرتے ہوئے بھی ملکی سطح کی مقتدرہ کارگر رہے گی۔

مستقبل کے پیشِ نظر اُمید کی جانی چاہیے کہ اقوام متحدہ کو فیڈریشن کی شکل دے دی جائے گی اور اور اُسے فرد پر نافذ العمل قانون سازی کے اِختیارات حاصل ہوں گے۔ تبھی حقیقی معنوں میں اصل مجرموں کے خلاف کارروائی ممکن ہوگی اور بے گناہ لوگ خوامخواہ کے عذاب سے بچ جائیں گے۔

امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل میں رائے عامہ بین الاقوامی قانون سے اِس درجہ واقف ہو جائے گی کہ ہٹلر اور صدّام حسین جیسے لوگ دنیا کو اپنے شکنجے میں نہیں لے سکیں گے۔ لیکن اِس سے پہلے ایک اچھی منضبط عالمی کمیونٹی کا قیام ضروری ہے جس کا ہر فرد خود کو اِنسانیت کے لیے لازِم قوانین کا پابند خیال کرے گا۔

نورمبرگ پرنسپلز

جنگِ عظیم دوم کے خاتمے پر جب نازیوں کے ہاتھوں ہونے والے ظلم وستم منظرِ عام پر آئے تو فیصلہ کیا گیا کہ نازی رہنماؤں پر امن کے خلاف جرم، دیگر جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم کے مقدمات چلائے جائیں۔ مقدمات کے طریقے پر ابتدائی

MashalBooks.org

اختلافات کے بعد اتحادی ممالک میں اتفاقِ رائے پیدا ہوا کہ چوبیس عہدیداران اور فوجی رہنماؤں پر نازی سیاست کے سابقہ مرکز جرمن شہر نورمبرگ میں ایک بین الاقوامی فوجی ٹریبونل مقدمہ سنے گا۔ ان میں سے دو ملزمان نے خودکشی کر لی۔ ایک مردہ قرار پایا لیکن اس کیخلاف سماعت ہوئی۔ باقی اکیس میں سے گیارہ کو سزائے موت، آٹھ کو طویل قید اور تین کو بَری کیا گیا۔ جاپان میں بھی اسی طرح کے مقدمات چلے۔

1946ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے متفقہ طور پر نورمبرگ ٹریبونل کے منشور میں بیان ہونے والے اصولوں کو بین الاقوامی قانون کی حیثیت دی۔ ان اصولوں کو باقاعدہ شکل دینے کے لیے جنرل اسمبلی نے انٹرنیشنل لاء کمیشن تشکیل دیا جس کے نتائج ذیل میں دیئے جارہے ہیں:

اصول 1: کوئی شخص بھی جو بین الاقوامی قانون کے تحت جرم قرار پانے والا عمل کرتا ہے وہ اس کا مرتکب اور سزا کا مستوجب ہوگا۔

اصول 2: اگر بین الاقوامی قانون کے تحت جرم قرار پانے والا عمل داخلی قانون میں کسی سزا کا مستوجب نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ شخص مذکورہ بین الاقوامی قوانین کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

اصول 3: اگر بین الاقوامی قانون کے تحت جرم کی ذیل میں آنے والا فعل کسی ریاست کا سربراہ یا ذمہ دار حکومت کا عہدیدار کرتا ہے تو بین الاقوامی قانون کے تحت وہ بھی مجرم اور سزا کا مستوجب ہوگا۔

اصول 4: اگر کوئی شخص بین الاقوامی قوانین کے تحت جرم پانے والا عمل اپنی حکومت یا کسی افسر اعلیٰ کی ہدایت پر بھی کرتا ہے تو وہ بھی اس کی ذمہ داری سے بری نہیں ہوگا۔

اصول 5: بین الاقوامی قانون کے تحت ملزم قرار پانے والے شخص کو حقائق اور قانون کی روشنی میں منصفانہ مقدمہ کا حق حاصل ہوگا۔

اصول 6: مندرجہ ذیل عمل بین الاقوامی قانون کے تحت جرم قرار پائیں گے:

a) امن کے خلاف جرم جس میں جارحیت کی منصوبہ بندی، تیاری، پہل یا بین الاقوامی معاہدوں اور یقین دہانیوں کی خلاف ورزی اور اس ذیل میں آنے والی منصوبہ بندی میں شمولیت شامل ہے۔

MashalBooks.org

b) جنگی جرائم میں جنگی قیدیوں یا دیگر اشخاص کے ساتھ بدسلوکی اور قتل شامل ہے۔ اغوا شدگان اور یرغمالیوں کا قتل، سرکاری یا نجی جائیداد کی توڑ پھوڑ اور شہروں اور دیگر آبادیوں کی تباہی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جنہیں بغیر کسی شدید ضرورت کے تباہ کیا جاتا ہے۔

c) انسانیت کے خلاف جرائم میں تعذیب، قتل، قید، تشدد، نسل کشی، زنا اور دیگر غیر انسانی اعمال شامل ہیں جنہیں شہری آبادی کے خلاف روا رکھا جائے۔

اصول 7 : جنگی جرائم، امن کے خلاف جرم یا انسانیت کے خلاف جرم، جن کی صراحت اصول 6 میں کی گئی ہے، میں شرکت اور معاونت بھی جرم ہے۔

آج روانڈا اور سابقہ یوگوسلاویہ میں نسل کشی اور جنگی جرائم کے مرتکب افراد پر مقدمہ چلانے کے لیے بین الاقوامی فوجداری عدالت انہی نورمبرگ اصولوں پر عمل کر رہی ہے۔

ان اصولوں سے فوجیوں کے مقام و مرتبے پر روشنی پڑتی ہے اور بڑی دلچسپ صورتحال سامنے آتی ہے۔ اصولوں کے تحت قرار پاتا ہے کہ جنگ میں شامل افراد کا اخلاقی و قانونی فرض ہے کہ وہ جنگ میں شمولیت سے پہلے اس کے متعلق اپنی رائے قائم کریں۔ اگر کوئی سپاہی کسی غیر قانونی جنگ میں شرکت کرتا ہے تو اسے بین الاقوامی قانون کے تحت سزا دی جاسکتی ہے اور یاد رہے کہ سلامتی کونسل کے فیصلے کے برعکس ہونے والی ہر جنگ غیر قانونی ہے۔ سپاہی کے پاس ایسا کوئی جواز نہیں کہ وہ احکام سے مجبور تھا۔ فوج کی تربیت اسی طرح کی جاتی ہے کہ وہ خود کو جنگ کے اخلاقی و قانونی بوجھ سے مامون خیال کرتا ہے۔ لیکن نورمبرگ اصول ایک بار پھر اس بوجھ کو فرد کی سطح تک لے جاتے ہوئے سپاہی پر بھی عائد کر دیتا ہے۔

انصاف کی بین الاقوامی عدالت

1893ء میں نیدرلینڈ کی حکومت نے پرائیویٹ انٹرنیشنل لأ پر ایک کانگرس منعقد کی۔ اس کا مقصد قانون کے اس پہلو کے تحت آنے والے قوانین کی وحدت تھا۔ 1893ء سے لے کر 1996ء تک اس کانگرس نے 39 بین الاقوامی کنونشن منظور کئے ہیں۔

جنگِ عظیم اوّل کے بعد جمعیّتِ اقوام نے انصاف کی بین الاقوامی مستقل عدالت

قائم کی۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد اقوام متحدہ کے بانیوں نے اس عدالت کی جگہ انصاف کی بین الاقوامی عدالت قائم کر دی۔

1946ء سے 1996ء تک اِس عدالت نے ریاستوں کے درمیان 47 تنازعات نمٹائے، 61 فیصلے دیئے اور 23 مشاورتی آراً جاری کیں۔ چونکہ اس عدالت کی عملداری ریاستوں کے درمیان تنازعات تک محدود ہے۔ چنانچہ عدالت میں دونوں ریاستوں کو آنا پڑتا ہے اور دونوں کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ عدالت کے فیصلے کی پابند رہیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ عدالت کے پاس بہت کم معاملات لائے جاتے ہیں۔ ریاستوں کے مابین تنازعات کی صورت میں ان میں سے کسی ایک کو احساس ہوتا ہے کہ وہ غلط ہے اور اسی لیے وہ انصاف کی بین الاقوامی عدالت میں جانے کو متفق نہیں ہوتی۔

بالعموم جب بین الاقوامی یا سرکاری تنظیموں کو دورانِ کار قانونی مسائل کا سامنا ہوتا ہے تو وہ مشاورتی آراً کے لیے اِس عدالت سے رجوع کرتی ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے صحت کی عالمی تنظیم سے مل کر نیوکلیائی ہتھیاروں کا معاملہ عدالت کے سامنے رکھا تھا اور، نتیجتاً عدالت نے 1995ء میں نیوکلیائی ہتھیاروں پر اپنی تاریخ مشاورتی رائے دی تھی۔

یوں دیکھا جائے تو عالمی عدالت بین الرّیاستی معاملات نمٹاتی ہے جبکہ نورمبرگ اصولوں کا تعلق جرائم کی انفرادی ذمہ داری سے ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی عدالت نورمبرگ اصولوں کے نفاذ کے لیے کسی طرح بھی موزوں ادارہ نہیں۔

بین الاقوامی فوجداری عدالت

1998ء میں روم میں اکٹھے ہونے والے 120 ملکوں کے نمائندگان نے بین الاقوامی فوجداری عدالت کے قیام پر دستخط کیے۔ نسل کشی، انسانیت کے خلاف جرائم، جنگی جرائم اور جارحیت اس عدالت کی عملداری میں آتے ہیں۔ ضروری توثیق وغیرہ میں چار سال لگ گئے لیکن 11 اپریل 2002ء تک 66 اقوام نے اِس معاہدے کی توثیق کر دی تھی جبکہ مثبت فیصلے کے لیے 60 ووٹوں کی ضرورت تھی۔

بلا مبالغہ فوجداری کی اس بین الاقوامی عدالت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یوں بالآخر افراد کو بین الاقوامی قانون کی پابندی کروانے کا ایک ذریعہ میسر آیا۔ افراد کو احساس ہو

MashalBooks.org

گیا کہ اب بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہوسکتی ہے۔* لگتا ہے کہ الیگزینڈر ہملٹن کا خواب پورا ہونے کو ہے۔

اس وقت تک انصاف کی بین الاقوامی عدالت یعنی آئی سی سی کی عمل داری چند خاص جرموں تک محدود ہے۔ مثلاً یہ عدالت جارحیت کے جرم کی سماعت نہیں کرسکتی۔ بہر کیف عالمی برادری کو موقع ملا ہے کہ وہ عدالت کی کارگزاری دیکھے۔ امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل کی کمیونٹی اس کی عملداری کو وسیع کرنے کی کوشش کرے گی۔

1998ء میں اس عدالت کے قیام کے خلاف صرف سات ووٹ آئے۔ یعنی چین، عراق، لیبیا، یمن، قطر، اسرائیل اور ریاستہائے متحدہ۔ 1998ء میں منفی ووٹ کے باوجود 2000ء میں صدر کلنٹن نے قانونِ روم پر دستخط کر دیئے۔ تاہم دو سال کے بعد بش انتظامیہ نے یہ دستخط واپس لئے اور اس عدالت کے خلاف ایک جامع مہم چلانے لگی۔ اگست 2002ء میں بش نے امریکی فوجیوں کے تحفظ کا قانون "American Service Members Protection Act" پر دستخط کر دیئے۔ اور یوں آئی سی سی تعاون ختم کرنے کا مرتکب ہوا۔ اس کے بعد امریکی صدر نے اعلان کر دیا کہ جب تک آئی سی سی امریکیوں کو اپنے قوانین سے امنیت نہیں دیتی امریکہ اس کی امن کوششوں میں تعاون نہیں کرے گا۔ بعد ازاں امریکہ نے کئی ممالک سے دوطرفہ بنیادوں پر معاہدے کئے کہ امریکی شہریوں کو بین الاقوامی فوجداری عدالت کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

عدالت کے خلاف بش کی اس مہم کے محرکات قابلِ فہم ہیں۔ سلطنت قائم رکھنے کے لیے جنگ ضروری ہے جبکہ نورمبرگ پرنسپل، انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ، بین الاقوامی فوجداری عدالت اور اقوام متحدہ کے منشور سمیت ایسے تمام بین الاقوامی ادارے جنگ کو غیر قانونی قرار دلوانا چاہتے ہیں۔ بالخصوص نورمبرگ اصول اور فوجداری عدالت کا منشا ہے کہ امن کے خلاف جرائم کی ذمہ داری افراد پر ڈالی جائے۔ اب اصل ذمہ داری سیاسی رہنما کی ہے۔ اب سپاہی بحیثیت فرد اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ بش اور اس کے ساتھی چاہتے ہیں کہ جنگیں چھیڑتے رہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ ان کے ممالک فوجی اعتبار سے اتنے طاقت ور ہیں کہ بین الاقوامی قانون ان کے مفاد میں نہیں۔ اب یہ فیصلہ دنیا کے باقی

* اس لیے کہ یہ معصوم اور مجرم دونوں کو ساتھ ساتھ سزا دیتا ہے۔

MashalBooks.org

ممالک کو کرنا ہے کہ وہ ریاستہائے متحدہ کو قانون سے باہر اور ماورا رہنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں۔ یہ مسئلہ امریکی عوام کا بھی ہے کہ وہ اپنی قوم کو ایک بدمعاش ریاست کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ

10 دسمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ اپنا لیا۔ 48 ریاستوں نے اس کے حق میں ووٹ دیئے اور 8 ریاستوں نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ کسی ایک ریاست نے بھی اس کے خلاف ووٹ نہ دیا۔ اس اعلامیے کے ابتدایہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا معیار ہے جہاں تک پہنچنا تمام قوموں اور انسانوں کے لیے ضروری ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اسے پیش نظر رکھتے ہوئے تمام دنیا آزادیوں اور حقوق کی ترویج کرے گی۔

اس اعلامیہ کے آرٹیکل 1 اور 2 کے مطابق ''تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار اور حقوق کے لحاظ سے بھی مساوی ہیں'' اور اسی لیے اس اعلامیہ میں بیان شدہ حقوق ہر شخص کو بلا امتیاز حاصل ہیں۔ زندہ رہنا، آزاد رہنا اور شخصی اور ملکیتی تحفظ بھی ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ ظلم و تشدد اور انسانی وقار کے منافی سزائیں منع ہیں۔ اس اعلامیہ کے تحت غلامی اور غلاموں کی تجارت بھی ممنوع قرار دی گئی۔ قرار پایا کہ قانون سب کے لیے مساوی ہوگا اور کسی بھی شخص کو بلاوجہ گرفتار، نظر بند یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ غیر جانبدارانہ سماعت اور خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ضروری تمام سہولتیں مہیا کئے بغیر ہر شخص کو بے گناہ تصور کیا جائے گا۔ کسی شخص کی خلوت میں مداخلت نہیں ہوگی اور اس حوالے سے اس کے خاندان، گھر یا خط و کتابت میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ انفرادی عزتِ نفس کا مجروح کرنا بھی جرم قرار پایا ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ریاست کی حدود میں آزادی کے ساتھ حرکت اور کسی بھی جگہ رہائش اختیار کر سکتا ہے۔ اسے اپنے ملک سے جانے اور واپس آنے کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو قومیت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور کسی کو قانونی تقاضے پورے کئے بغیر قومیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قانونی طور پر متعین کی گئی عمر کے ہر شخص کو شادی اور خاندان بنانے کا حق حاصل ہے۔ شادی کے رشتے میں منسلک مرد و زن کے حقوق یکساں

MashalBooks.org

ہیں اور دونوں کو اسے توڑنے کا حق حاصل ہے۔ شادی کے لیے فریقین کی رضا مندی کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ اس اعلامیہ کے اندر مذہب، ضمیر اور رائے رکھنے اور اس کے اظہار کی آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح ہر کسی کو پر امن اجتماع اور ایسوسی ایشن بنانے کی آزادی ہے۔ ہر کوئی حکومت سازی میں براہ راست یا منتخب نمائندے کے ذریعے حکومت سازی میں حصہ لینے کا حق رکھتا ہے۔ حکومت کی بنیاد لوگوں کی رضا مندی پر ہوگی جسے وہ وقتاً فوقتاً اور منصفانہ انتخابات کے موقع پر عالمگیر اور مساوی رائے دہندگی کے ذریعے ظاہر کریں گے۔ رائے دہی کا خفیہ ہونا لازم ہے۔

ہر کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی طور پر ترقی کے لیے موزوں حالات کا طلب گار ہو۔ ہر کسی کو روزگار کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کا روزگار منتخب کرے گا اور وہ موزوں حالات کار طلب کر سکتا ہے۔ اس کا معاوضہ انسانی وقار کے منافی نہیں ہونا چاہیے اور اگر ضروری ہو تو اسے سماجی معاونت بھی دی جائے۔ ٹریڈ یونین بنانا اور اس میں شامل ہونا کارکنوں کا حق ہے۔

اعلامیہ کے آرٹیکل 25 کی رُو سے ہر کسی کو خوراک، لباس، گھر اور طبی سہولتوں سمیت موزوں معیار زندگی کا حق حاصل ہے۔ تمام لوگوں کو بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی یا بڑھاپے کی صورت میں تحفظ کا حق حاصل ہے۔ حاملہ خواتین کو خصوصی طور پر درکار، معاونت کا حق حاصل ہے اور پیدا ہونے والے بچے، خواہ وہ باقاعدہ شادی کے نتیجے میں پیدا ہوں یا شادی کے بغیر، یکساں سماجی تحفظ کے حق دار ہیں۔ ہر کسی کو تعلیم کا حق حاصل ہے جو ابتدائی مراحل میں مفت ہوگی۔ تمام لوگوں کو مقررہ معیار کے مطابق اعلیٰ تعلیم کا حق حاصل ہے۔ تعلیم کے ذریعہ انسانی شخصیت کی ترقی اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا اثبات کیا جائے گا۔ تعلیم کے نتیجے میں باہمی تفہیم، رواداری اور مختلف اقوام، نسلوں اور مذہبی گروپوں کے مابین دوستی کی ترویج ہونی چاہیے۔* یہ اعلامیہ توثیق کرتا ہے کہ ہر کسی کو کمیونٹی کی ثقافتی زندگی میں شرکت، فنون سے محظوظ ہونے اور سائنس کی برکات سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے۔ مصنفوں، فنکاروں اور موجدوں کے اخلاقی اور مادی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

* انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے میں آرٹیکل 25 جیسی کئی دفعات کو محض اچھی خواہش کہا جا سکتا ہے۔ تاہم مستقبل کی پر امن دنیا کی تعمیر کے لیے انہیں پیمانے بنایا جا سکتا ہے۔

MashalBooks.org

12 دسمبر 1989ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بچوں کے حقوق کا کنونشن پاس کیا جسے حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کا تکملہ سمجھا جا سکتا ہے۔

یقیناً پوری دنیا میں انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کی عملداری کو یقینی بنانا آسان نہیں۔ اس کے باوجود بین الاقوامی فوجداری عدالت کے قیام کی زیریں سطح پر کارفرما انفرادی ذمہ داری کا حصول ایک مفید نظیر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس اصول کے استحکام اور آئی سی سی کو موثر بنا کر ہم ایک پر امن عالمی معاشرت کے نزدیک تر ہو سکتے ہیں۔ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ کسی ایک قوم یا اقوام کے گروہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کے نفاذ کے نام پر دوسرے ممالک میں دخیل ہوتا رہے۔ اس فریضہ کے لیے ہمیں بین الاقوامی فوجداری عدالت اور اقوام متحدہ کی پولیس فورس کو مناسب حد تک مضبوط کرنا ہوگا۔

ٹوبن ٹیکس

طاقتور اقوام متحدہ کے لیے ضروری ہے کہ اسے اقوام متحدہ پر متاثر ہونے والے دولت مند ممالک کی مالی زیردستی سے نجات دلائی جائے۔ اس کے لیے ییل یونیورسٹی کے نوبل انعام یافتہ ماہر اقتصاد جیمز ٹوبن کی پیش کردہ تجویز ٹوبن ٹیکس مناسب لگتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اتنی معمولی شرح بھی کرنسیوں کے تبادلوں کی شرح پر مثبت اثرات ڈال کر انہیں مستحکم کرے گی۔ ٹوبن کا خیال ہے کہ یہ رقم اقوام متحدہ کو ملنی چاہیے۔

ایک اندازے کے مطابق اقوام متحدہ کو یوں 100 تا 300 بلین ڈالر سالانہ ملیں گے۔ یوں اقوام متحدہ کے مختلف کاموں کو تقویت ملے گی اور اس کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ بین الاقوامی سیاسی تنازعات میں اس کا کردار زیادہ فیصلہ کن ہو جائے گا۔

ٹوبن ٹیکس سے قطع نظر بھی اقوام متحدہ کی آمدنی بڑھانے کی کچھ تجاویز آئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ سمندری وسائل کا کچھ حصہ اقوام متحدہ کو دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج پر ٹیکس لگانے کا اختیار بھی ہونا چاہیے۔ تاہم اقوام متحدہ پر کنٹرول کے خواہاں چند ممالک* اقوام متحدہ کی اس طرح کی آمدنی کے خلاف ہیں۔

* خاص طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ جس نے ٹوبن ٹیکس (Tobin Tax) متعارف کروانے پر اقوام متحدہ سے نکل جانے کی دھمکی دی ہے۔

MashalBooks.org

بہر حال یہ اقدام اقوام متحدہ کی مستقبل کی ترقی کے لیے لازم ہیں۔ اختیار کے بغیر کوئی حقیقی حکومت برقرار نہیں رہ سکتی۔ یہ اتنا ہی لازم ہے جتنا فرد پر عائد قوانین کی تشکیل اور اطلاق۔

غربت اور جنگ کے درمیان تعلق

جب ہم جنگ کے اسباب میں اقتصادی ناہمواری کو بھی شامل کرتے ہیں تو ہمیں اس کے سدِّ باب کے لیے بھی اِقتصاد کو شامل رکھنا ہوگا۔ بطور ادارہ جنگ ختم کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ اقوام متحدہ کو تقویت دی جائے، اس کے پاس ٹیکس لگانے کے اختیارات موجود ہوں، یہ افراد پر نافذ العمل قوانین بنا سکے۔ اور ساتھ ہی ساتھ رائے دہندگی کے نظام کو زیادہ جمہوری بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے خوشحال خطے ان اصلاحات کی مخالفت کریں گے۔ مثلاً انہیں خوف ہوسکتا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کو ٹیکس لگانے کا اختیار مل جاتا ہے تو ان کی دولت کا کچھ حصہ دنیا کے غریب ترین ممالک کو منتقل ہو جائے گا۔

سرد جنگ کے بعد جرمنی کے اکٹھا ہونے کے عمل میں اسی طرح کا سامنا تھا۔ نظر آتا تھا کہ اس صورت میں ملک کے دو حصوں کو اقتصادی سطح پر مساوی رکھنے کے لیے مغربی جرمنی کو مالی قربانی دینا پڑے گی۔ لیکن انضمام نو کی خواہش اتنی شدید تھی کہ ضروری قربانی دی گئی اور جرمنی متحد ہو گیا۔

اسی طرح یورپی یونین کی تشکیل اور مشرق کی طرف اس کی توسیع میں بھی امیر اور غریب علاقوں میں تضاد کا مسئلہ موجود تھا۔ کیا یورپ کی امیر اقوام کو اپنے غریب ہمسایوں کی مدد کرنے کے لیے بھاری قربانیاں دینی پڑیں؟ کیا یورپ کے غریب علاقوں کے کارکن جوق در جوق امیر علاقوں کو چلے گئے؟ بلاشبہ اس طرح کے مسائل موجود تھے۔ لیکن یورپی یونین اور جرمن اتحاد دونوں کے محرکات بہت قوی تھے۔ دنیا کی دو بڑی جنگیں لڑنے کے بعد یہاں کے سیاست داں تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ مستقبل میں اس طرح کے واقعات نہیں ہوں گے۔

عالمگیر پیمانے پر دیکھا جائے تو اقتصادی عدم مساوات یورپ کے اندر کہیں کم ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ، کینیڈا اور مغربی جرمنی کی آبادی عالمی آبادی کا صرف 11.6 فیصد ہے لیکن یہاں کی نجی کھپت عالمی کھپت کا 60.2 فیصد ہے۔ ریاستہائے متحدہ میں سالانہ گھر داری کافی نفر خرچہ 21,515 ڈالر جبکہ تنزانیہ میں 375 ڈالر ہے۔ ڈنمارک میں

ہر ایک ہزار لوگوں میں سے 650 کے پاس اپنا کمپیوٹر موجود ہے جبکہ ہندوستان اور نائیجیریا میں یہی تعداد بالترتیب چھ فی ہزار اور سات فی ہزار ہے۔

اقوام متحدہ کے ایک تخمینے کے مطابق دنیا کے چھتیس ممالک میں بسنے والے خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ ان میں سے 24 ممالک افریقہ، 7 ایشیا، 5 لاطینی امریکہ اور 2 یعنی چیچنیا اور سربیا اینڈ مانٹی نیگرو یورپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر دنیا کی آبادی اسی طرح بڑھتی چلی گئی تو مستقبل میں خوفناک قحط صاف نظر آتے ہیں۔

آبادی میں تیز رفتار اضافہ غربت کا نتیجہ بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔ آج کی دنیا میں بسنے والے انسانوں کا ایک بہت بڑا حصہ صاف پانی، ابتدائی تعلیم اور مناسب غذا سے محروم ہے۔ اس مسئلے کا ایک خوفناک پہلو یہ ہے کہ شدید غریب ممالک کی آبادی ہر 25 سال بعد دوگنا ہو جاتی ہے۔ بنیادی ترقی کے لیے کیے گئے اقدام کی شرح آبادی میں اضافے کی شرح کا ساتھ نہیں دے پاتی۔

غریب ملکوں کا واجب الادا قرض بھی ان کی ترقی کی راہ کا روڑا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو دیا گیا زیادہ تر قرض عسکری ساز و سامان کی خریداری پر خرچ ہوا۔ اس سے قطع نظر کہ اس قرض کے نتائج منفی نکلے یہ قرض موجود ہے اور شرح سود اتنی بڑھ گئی ہے کہ رقم کے بہاؤ کا حاصل غریب ممالک سے صنعتی ممالک کو ہو رہا ہے۔ عالمی اقتصادی عدم مساوات کے سبب اقوام متحدہ کی تقویت کے لیے ناگزیر اصلاحات میں رکاوٹ پیش آتی ہے اور یوں غریب اور امیر اقوام کے درمیان بڑھتا فرق جنگ کا سبب بنتا ہے۔ جنگ رکوانے کے لیے عالمی حکومت ضروری ہے لیکن آج کی دنیا میں موجود عدم مساوات کے سبب یہ حکومت قائم نہیں ہو پاتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عالمی اقتصادی عدم مساوات اور اس کے ساتھ وابستہ جنگ کے ادارے کو ختم کر سکیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا جواب فیڈریشنوں کی ساخت میں پنہاں ہے۔

فیڈریشن کی صورت میں تمام اختیارات جو واضح طور پر وفاقی اتھارٹی کو نہیں دیئے جاتے رکن ریاستوں کے پاس رہتے ہیں۔ چونکہ اس وقت تک اقوام متحدہ کے پاس افراد پر نافذ العمل قوانین بنانے کا اختیار موجود نہیں۔ چنانچہ اسے فیڈریشن نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم بتدریج اور محتاط طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے اسے فیڈریشن میں بدلا جا سکتا ہے۔ آغاز میں اسے بہت کم اختیارات دیئے جا سکتے ہیں جن کا تعلق مثال کے طور پر عالمی ٹیکسوں سے ہو سکتا

MashalBooks.org

ہے۔ ان ٹیکسوں کی بدولت دنیا کے امیر اور غریب حصوں کے مابین موجود اقتصادی فرق قدرے کم ہوسکتا ہے۔ یوں اقوام متحدہ کو فیڈریشن بنانے کا عمل تیز ہونے لگے گا۔

غربت اور جنگ کے درمیان ایک اور تعلق پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ جنگ غربت کی ایک وجہ ہے۔ مثال کے طور پر سرد جنگ کے دوران طرفین نے افریقہ میں چھوٹے ہتھیار متعارف کروائے جو ابھی تک موجود ہیں اور جھگڑوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ان جھگڑوں کے سبب اقتصادی ترقی رکی ہوئی ہے اور لوگ بڑی تعداد میں بے گھر ہو رہے ہیں۔ خوراک اور زراعت کی بین الاقوامی تنظیم (FAO) کا تخمینہ ہے کہ دنیا میں اس وقت دو سے اڑھائی کروڑ تک موجود تارکین وطن میں سے خاصی بڑی تعداد کا تعلق افریقہ سے ہے۔ افریقی ممالک میں مدتوں سے جاری قحط کی شدت اندرونی جھگڑوں کے سبب شدید تر ہو رہی ہے۔ تارکین وطن اور اندرون ملک بے گھر ہونے والے مسئلے کو اور بھی گھمبیر کر رہے ہیں۔ انگولا، برونڈی، سنٹرل افریقن ریپبلک، ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو، آئیوری کوسٹ، اریٹریا، ایتھوپیا، گنی، لائبیریا، سیرالیون، صومالیہ، سوڈان، یوگنڈا اور زمبابوے اسی طرح کے خطے ہیں۔

جنگی سامان پر خرچ ہونے والی رقوم کو غربت کے خاتمے میں برتا جا سکتا ہے۔ واشنگٹن ڈی۔ سی میں قائم ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کا تخمینہ ہے کہ دنیا کی تمام آبادی کو صرف 5 بلین ڈالر سالانہ کے خرچ سے خاندانی منصوبہ بندی کی افادیت سے آگاہ کیا جاسکتا ہے اور اتنی ہی رقم سے ناخواندگی دور ہوسکتی ہے۔ دس بلین ڈالر کے سالانہ خرچ سے ساری دنیا کے لوگوں کو پینے کا صاف پانی میسر آسکتا ہے۔ 19 ملین ڈالر خرچ کئے جائیں تو غذا کی کمی کا کم از کم عارضی تدارک ہوسکتا ہے۔ یوں حاصل ہونے والا عالمی استحکام اس مسئلے کے مستقل حل میں معاون ثابت ہوگا۔ ان معروضات سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ اور غربت باہم وابستہ مسائل ہیں اور انہیں بیک وقت ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

اقوام متحدہ کی اصلاح کے لیے کچھ ٹھوس اقدامات

(1) کرنسی کے بین الاقوامی لین دین پر ٹیکس لگا کر اقوام متحدہ کو معاونت دی جائے۔

(2) اقوام متحدہ کے یونیسکو، ڈبلیو ایچ او، ایف اے او اور دیگر ترقیاتی اداروں کے

MashalBooks.org

بجٹ میں کم از کم بیس گنا اضافہ کیا جائے تا کہ یہ ادارے ایڈز، مزمنہ امراض، خوراک کی کمی، ماحولیاتی آلودگی، توانائی کے متبادل ذرائع، آبادی کے استقرار، امن کی تعلیم، خوراک کی کمی اور پینے کے پانی کی فراہمی جیسے منصوبوں پر کام کر سکیں۔ ان اداروں کو وسائل میسر آئیں گے تو سائنس داں اسلحہ کی صنعت کی بجائے ان اداروں میں کام کرنے کو ترجیح دیں گے۔

(3)اقوام متحدہ کے پاس اپنے ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل ہونا ضروری ہیں جو غیر جانبدار رہتے ہوئے خبروں، ثقافت، اور تمدن وغیرہ پر غیر جانبدارانہ پروگرام نشر کریں۔

(4) اقوام متحدہ کو رائے دہندگی کے اصلاح یافتہ نظام پر مبنی قانون سازی کے اختیارات دیئے جائیں۔ یوں اقوام متحدہ افراد کی سطح پر نافذ العمل قانون بنا سکے گی۔

(5)فوجداری کی بین الاقوامی عدالت کا دائرہ کار بڑھایا جائے اور اس کی عملداری وسیع کی جائے۔

(6) ترقی یافتہ صنعتی ممالک سے ترقی پذیر ممالک کو اسلحہ کی ترسیل رکوائی جائے۔

(7)اقوام متحدہ کو مستقل مضبوط اور متحرک فوج دی جائے جو براہ راست سیکرٹری جنرل کے ماتحت ہو۔ مختلف اقوام کے نمائندگان پر مشتمل یہ فوج سلامتی کونسل اور فوجداری کی بین الاقوامی عدالت استعمال کریں گے۔

(8)سلامتی کونسل کو ویٹو سے نجات دلائی جائے۔

(9) تیسری دنیا کے قرض کے مسائل پر توجہ دی جائے۔ عالمی بینک اور دیگر مالیاتی اداروں کی اصلاح کی جائے۔

بڑی اقوام کی حکومتیں بہ مقابلہ عالمی حکومت

بڑے جغرافیائی علاقے میں داخلی امن کا حصول بھی کوئی لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا کے کئی خطوں میں یہ مسئلہ حل کیا جا چکا ہے جن میں سے بعض اتنے بڑے ہیں کہ اپنے اندر ایک جہان ہیں۔ یہاں چین، انڈیا، برازیل، آسٹریلیا، روسی فیڈریشن، ریاستہائے متحدہ اور سب سے بڑھ کر یورپی یونین کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ان بہت بڑی معاشرتوں میں سے ہر ایک میں کئی زبانیں، کئی مذاہب، کئی نسلیں آباد ہیں اور غربت اور امارت کا فرق بھی موجود

MashalBooks.org

ہے۔ اگر ان خطوں میں پر امن اور مبنی بر تعاون معاشرے وجود میں آسکتے ہیں* تو یہ کام عالمی سطح پر بھی کیا جاسکتا ہے۔

بالآخر قومیں داخلی امن کے لیے کون سے طریقے استعمال کرتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ حکومت کو ایسے اختیارات دینا لازم ہے کہ وہ اپنے ملک میں موجود افراد پر نافذ العمل قوانین بنا سکے۔ دوسرے یہ کہ اسے ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ حقیقی حکومت کے لیے ضروری یہ تقاضے پہلے بھی بیان ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک تیسری ضرورت پر بات ہوگی۔

تقریباً تمام اقوام میں مرکزی حکومت کے پاس اپنی ذیلی اکائیوں کے مقابلے میں زیادہ عسکری قوت موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ کی فوج الی نائے کی ریاستی ملیشیا سے طاقت ور رکھی جاتی ہے۔ قوت کے اسی عدم توازن کے سبب ریاستہائے متحدہ کی وفاقی حکومت مستحکم رہتی ہے۔ ایف بی آئی کسی ملزم کو گرفتار کرنا چاہتی ہے تو وہ الی نائے کی طرف سے مداخلت کی توقع کئے بغیر اسے گرفتار کر لیتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ریاستی حلقوں کو اس پر اعتراض ہو لیکن اس کے باوجود اسے وفاق کو اس کی گرفتاری کی اجازت دینا پڑتی ہے۔ بصورت دیگر امن قائم نہیں رہ سکتا۔ تمام اقوام جہاں داخلی امن موجود ہے اسی اصول پر عمل پیرا ہیں۔ درست ہے کہ بعض اقوام میں ذیلی گروہ قومی حکومت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہیں لیکن وہاں اکثر و بیشتر خانہ جنگی کی نوبت آجاتی ہے۔

داخلی امن کے حامل بڑے خطوں میں یورپ کو امتیاز حاصل ہے کہ اس کی رکن ریاستوں کے پاس اپنی اپنی طاقت ور فوج بھی موجود ہے۔ مستقبل میں اقوام متحدہ کی تقویت اور اصلاح کے ذریعے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لیے یورپی یونین ایک حقیقت پسندانہ نمونہ فراہم کرتی ہے۔ البتہ مستقبل بعید میں ہم ایک ایسی عالمی فیڈرل مقتدرہ کا تصور کر سکتے ہیں جس کی قوت اپنی رکن ریاستوں سے زیادہ ہوگی۔ اور جب قومی فوج کی تعداد محض مقامی امن قائم کرنے کی ضرورت تک محدود کر دی جائے گی۔

آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ سیاسی اکائی کا حجم بڑھاتے ہوئے اسے قوم

* یہ بہرحال مان لینا چاہیے کہ یہ بڑی بڑی سیاسی اکائیاں نہ تو پوری طرح منصفانہ ہیں اور نہ ہی پرامن، اس کے باوجود ان میں خاصی حد تک داخلی امن اور سیاسی یکجائی موجود ہے۔

MashalBooks.org

کی سطح سے اٹھا کر عالمی سطح تک لے جایا جائے۔ خوفناک جدید ہتھیاروں کی موجودگی اور عالمی اقتصادی باہمی انحصار اسی امر کا متقاضی ہے۔ اگرچہ یہ ضرورت سائنس کی ترقی نے پیدا کی ہے لیکن سائنس ہی ہمیں سیاسی اکائی کی حدود کو پھیلانے کے ذرائع مہیا کر رہی ہے۔ اگر ہم اپنے پاس موجود معجزہ نما ذرائع ابلاغ کو مناسب طور پر استعمال کر سکیں تو نوع انساں کو ایک واحد مبنی بر تعاون معاشرے میں ڈھال سکتے ہیں۔

جنگ اور غلامی کا تقابل

اِس موقع پر جنگ اور غلامی کے اداروں کا تقابل خاصا مفید رہے گا۔ ہم میں سے کچھ لوگ دلیل دے سکتے ہیں کہ جنگ ہمیشہ سے موجود رہی ہے، انسانی تاریخ کا کوئی دور اس سے خالی نہیں تھا اور اسے ہمیشہ موجود رہنا ہے۔ اِس تشکیلی رویے کا جواب دینے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تاریخ کے بیشتر حصہ میں غلامی موجود تھی۔ مصر، روم اور یونان کے قدیم تمدنوں کی بنیاد غلامی پر تھی۔ اور ابھی حالیہ زمانے میں لاکھوں افریقی نئی دنیا اور مشرق وسطیٰ میں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ غلامی کا ادارہ بھی اتنا ہی مضبوط اور مستحکم تھا جتنا ہم جنگ کو سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ غلاموں کی تجارت سے اسی طرح استفادہ کرتے تھے جس طرح آج ہتھیار ساز کر رہے ہیں۔ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود آج دنیا کے کم و بیش تمام حصوں سے غلامی ختم ہو چکی ہے۔ آج ہم غلاموں سے بھرے جہازوں کی ہولناکی کو تعجب کے ساتھ یاد کرتے ہیں کہ آیا یہ سب کچھ ممکن تھا۔ ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ ہماری آنے والی نسلوں کو تعجب ہوگا کہ بیسویں صدی تک انسان کیوں کر جنگ و جدل میں مبتلا چلا آ رہا تھا۔ اگر ہم اپنے زیرِ دسترس وسیع تر وسائل تعمیری انداز میں استعمال کریں تو ساری نوعِ انسان خوش رہ سکتی ہے۔ یہ کام ہمارے بس میں ہے۔ ہمیں اِن انسانوں سے سبق لینا چاہیے جنھوں نے دنیا کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے کام کیا اور اُمید کرنی چاہیے کہ مستقبل میں جنگ کا یہ عہد فقط ایک دھندلی سی بھیانک یاد بن کر رہ جائے گی۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org